تسکین الفتن

فی

صلح الحسنؑ

از

علامہ عدیل اختر طاب ثراہ

سابق پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

شائع کردہ

تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ ۱۸ یو۔پی (انڈیا)

فون و فیکس: ۲۱۵۱۱۵

نام کتاب : صلح الحسنؑ
مصنف : علامہ عدیل اختر طاب ثراہ
کتابت : جے۔ احمد
سنہ طباعت : نومبر ۱۹۹۴ء
تعداد : ۳۰۰۰
ناشر : تنظیم المکاتب، لکھنؤ (انڈیا)
قیمت : ۲۵:۰۰

مراکز حصول:

۱۔ دفتر تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ ۱۸ (انڈیا)
۲۔ جامعۂ انوار العلوم، مرزا غالب روڈ، الہ آباد
۳۔ جامعۂ جوادیہ، پرہلا دگھاٹ، بنارس
۴۔ مولانا انیس الحسن صاحب قبلہ، A1 نیو شوکت سوسائٹی، ۱۹۔ نوروجی ہل روڈ، ڈونگری بمبئی ۹
۵۔ مولانا محمد علی آصف صاحب قبلہ، غازیپور، ڈاک خانہ گوگواں، ضلع مظفر نگر
۶۔ جناب غلام علی گلزار صاحب، رعنا واری حسن آباد، سری نگر، کشمیر

[illegible] جلال پور (فیض آباد)

فہرست

باسمہ سبحانہ

عرض تنظیم

صلح حسن علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے اور اس وقت منظر عام پر آئی تھی جب اردو کا دامن اس طرح کی علمی تصانیف سے خالی تھا۔

یوں بھی اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جس طرح علامہ مرحوم نے سبط اکبر امام حسن علیہ السلام کی صلح کے واقعہ کو اس وقت کے سیاسی، دینی اور تاریخی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ارباب فکر و دانش کے لئے ان کا ایک علمی عطیہ ہے۔

اس کتاب کی پہلی اشاعت ادارۂ تنظیم کے قیام سے صرف ایک دن پہلے بانیٔ تنظیم طاب ثراہ نے اپنے ہی قائم کردہ ادارہ "مکتبۂ افادات عدیل اختر" کی طرف سے کی تھی۔ ادھر بہت دنوں سے یہ کتاب کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھی۔ کتاب کی افادیت اور علمی و تحقیقی حیثیت کے پیش نظر بانیٔ تنظیم طاب ثراہ نے اس کی دوبارہ اشاعت کا پروگرام بنایا تھا، ساتھ ہی ساتھ کتاب کے عربی متن کی کچھ عبارتیں حذف کر دی تھیں کہ ان کا ترجمہ

کافی ہے۔ بعض جگہ کتاب کی عبارتوں پر نشانات لگائے تھے اندازہ ہے کہ حاشیہ پر تشریحی نوٹ لگانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی اچانک رحلت نے اس کام کو التوا میں ڈال دیا تھا۔

اب ہم بانیٔ تنظیم کی خواہش کے مطابق کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں چونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ بانیٔ تنظیم کیا ترمیم کرنا چاہتے تھے اس لئے ہم اصل کتاب شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ صاحبان علم و ارباب نظر اس سے خاطر خواہ استفادہ فرمائیں گے اور اسلامی تاریخ کے اس عظیم واقعہ کو اس کے صحیح مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

اس خدمت پر ہم بارگاہ الٰہی میں نذرانہ تشکر پیش کرتے ہوئے مزید توفیقات کے ملتجی ہیں۔

والسّلام

صفی حیدر

سکریٹری تنظیم المکاتب

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۲ء

حالاتِ مُصنّفؒ

ازجناب مولانا آغا مہدی صاحب مرحوم سابق مدیر الواعظ

ولادت

۲۹ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ منگل کے دن اپنے وطن علی نگر پالی ضلع گیا میں پیدا ہوئے اور تاریخی نام "عدیل اختر" رکھا گیا۔ آپ کا سلسلۂ نسب چھبیس ۲۶ واسطوں سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں مولانا حافظ فرمان علی صاحب مرحوم سے حاصل کرکے مرکز علم و عمل لکھنؤ میں آئے۔ یہ وقت وہ ہے کہ لکھنؤ مٹے حال پر بھی اہل کمال سے چھلک رہا ہے۔ فقہ، اصول، منطق و حکمت، ریاضی و فلسفہ، کلام و ادب و معانی بیان کے ماہر موجود ہیں، اور شہر کے ہر گوشہ میں درس و تدریس کا چرچا ہے۔ مشارع الشرائع مدرسۂ ناظمیہ میں مدارج علمیہ کی تکمیل فرمائی اور ممتاز الافاضل کی سند امتیاز خاص کے ساتھ حاصل کی۔ ممتاز الافاضل ہونے سے پہلے آپ الہ آباد یونیورسٹی کے اعلیٰ اسناد بھی حاصل کر چکے تھے۔ ناظمیہ مدرسہ میں درجہ فاضل کو ایک مدت تک آپ نے درس دیا اور سرکار نجم العلماء نے اس حسن خدمت کے صلے میں جو سند عطا کی اسے مولانا نے اپنے لئے تاج عزت قرار دے کر تمام سرکاری اور غیر سرکاری اسناد میں معزز سمجھا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں مدرسۃ الواعظین قائم ہوا۔ آپ پہلے طالب علم ہیں جنھوں نے افتتاح کے ساتھ مقاصد مدرسہ کو کامیاب بنایا۔ تین سال کی جد و جہد کے بعد سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ اپنی جماعت میں سب سے اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہو کر مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور صوبہ بہار و بنگال آپ کا مرکز تبلیغ قرار پایا۔ جہاں بھی آپ کا تقرر منجانب مدرسہ قرار پایا وہاں کی مقامی زبان حاصل فرمائی۔ چنانچہ بنگال میں بنگلہ زبان حاصل کی۔ کچھ مدت کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع میں شدھی کا زور ہوا۔ اس نازک فضا میں جس حسن و خوبی سے آپ نے مدرسہ کے مفاد کو کامیاب بنانے میں خدمات انجام دیں وہ آپ کے مخصوص کارناموں میں ہیں۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ کو مدرسہ نے جزائر افریقہ میں فریضۂ تبلیغ پر مامور کیا۔ قدیم ہندوستان کا صوبہ سرحد آپ کی واپسی کا بکمال شوق منتظر تھا۔ افریقہ سے واپسی کے بعد ہی باشندگان صوبہ سرحد کی دعوت پر مدرسہ نے مولانا کا مرکز تبلیغ پشاور مقرر کیا۔ یہاں کے زمانۂ قیام میں مدرسہ نے کچھ مدت کے لئے تبت کے دور افتادہ علاقہ میں آپ کو مامور کیا اور آپ وہاں گئے اور باشندگانِ تبت کو اپنی مذہبی خدمات سے جس طرح مطمئن فرمایا وہ ایک مفید اور دلچسپ تبلیغی شاہکار ہے جس کی روداد رسالہ 'الواعظ' کے صفحات میں موجود ہے۔ فرقۂ نوربخشیہ کے خیالات کو صحیح مرکز پر قائم کرنا اور دہنان جماعت کے غلط اصول کو شکست دینا آپ کے تجربہ اور تدبّر کی بہترین مثال ہے۔

یہاں سے واپسی کے بعد آپ اپنے مرکز تبلیغ صوبہ سرحد تشریف لائے اور سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ آپ نے اس ناہموار زمین کے ہموار کرنے میں صرف فرمایا۔ جون سنہ ۱۹۳۶ء میں آپ کا تقرر بحیثیت وائس پرنسپل مدرسۃ الواعظین ہوا۔ اہل پشاور مولانا کے لکھنؤ آنے پر کسی طرح رضامند نہ تھے مگر حضرت نجم العلماء کے فرمان سے سپر انداختہ

ہو کر رخصت کیا۔

آپ نے درس و تدریس کے نظام میں جدید اصلاحات پیش کئے اور اپنے تجربات کی بنا پر نصاب تعلیم تبدیل کر کے لباس نو پہنایا اس عہدہ پر خدمت کو ایک ہی سال ہوا تھا کہ پرنسپل صاحب نے انتقال فرمایا اور ارباب حل وعقد نے آپ کے خدمات کی قدردانی فرما کر پرنسپل کے عہدہ پر مقرر کیا۔ مولانا کا انتخاب عہدۂ پرنسپل پر ہونے کا اعلان ہوتے ہی پراونشل شیعہ کانفرنس صوبہ سرحد انجمن امامیہ بنگش استرزئی صوبہ کوہاٹ اور دیگر اداروں نے مدرسہ کو اپنے بیانات تبریک سے مطلع کیا جو 'الواعظ' یکم جولائی ۱۹۳۷ء میں موجود ہیں۔

۱۹۳۶ء سے تا انتقال آپ حضراتِ واعظین کی تعلیم و تربیت فرماتے رہے۔ آپ کے صفات پر مختصر روشنی ڈالنے کے لئے اخبار 'سرفراز' مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۳۷ء کے ایک طویل مضمون کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

"آپ سب سے پہلے طالب علم ہیں جنھوں نے مدرسہ میں جماعت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور آج تک مدرسہ کی تحریری و تقریری خدمت انجام دیتے رہے۔ اخبار کا مطالعہ کرنے والے اور مدرسۂ واعظین کے تبلیغی خدمات سے دلچسپی رکھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ موصوف نے ہندوستان کے علاوہ افریقہ اور تبت میں بھی تبلیغی خدمات انجام دی ہیں۔ موصوف اردو، فارسی و عربی کے ماہر ہونے کے علاوہ انگریزی گجراتی، پشتو، پنجابی اور سواحلی زبانوں میں بقدر ضرورت تحریر و تقریر فرما سکتے ہیں۔ موصوف نے مذاہب غیر کا غیر معمولی مطالعہ کیا ہے اور اس کے متعلق مفید و دلچسپ مضامین بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ آپ ہندی میں بھی واقفیت

رکھتے ہیں اور بآسانی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ فی زمانا جو طرز تبلیغ اقوام عالم کا ہے آپ اس سے بھی باخبر ہیں۔"

ظاہرداری اور نام و نمود سے آپ کو قطعی نفرت تھی۔ وسعت مطالعہ کا حال مدرسہ واعظین کے عظیم الشان کتب خانہ کی سیر سے دریافت ہو سکتا ہے۔ بکثرت وہ کتابیں ہیں جن پر عربی میں حواشی موجود ہیں۔ یہ علمی نوٹس جب تک کتب خانہ قائم ہے مرحوم کے باقیات الصالحات میں ہیں۔ ممدوح نے اپنی عمر میں جتنی قومی تحریکیں ہوئیں اُن کو کامیاب بنایا۔ محاذ حسینی اور تبرّا ایجی ٹیشن میں آپ ہی کے قلم کی گردش کا اثر تھا جو اسیری کے لیئے پشاور اور پنجاب اُمنڈ آیا۔ وہ منظر عام پر آنے کے عادی نہ تھے۔ جس مقصد کو صحیح سمجھتے تھے، اس کو مدد پہونچانے میں بلا تحریک مصروف ہو جاتے تھے۔ عشرہ اور چہلم کے دن اگر لکھنؤ میں قیام ہوا تو صرف ایک کالا کُرتا پہن کر اور سر و پا برہنہ کربلا تشریف لے جاتے تھے۔ مشاہد مقدسہ کی زیارت سے بھی خداوند عالم نے دو بار ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۹ء میں مشرف کیا اور آپ کو علامہ بروجردی مدظلہٗ کی وکالت کا بھی اعزاز حاصل تھا۔

انتقال سے دو سال پہلے زیارت حرمین کا بھی شرف حاصل ہوا اور حج بیت اللہ کی زیارت ہوائی جہاز سے کی۔ اس سفر کے دلچسپ اور تاریخی حالات 'استقلال' لکھنؤ کی متعدد اشاعتوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ جو آپ کی تالیف کی حیثیت ہے۔

تقاریر

دنیائے شیعیت کا چپہ چپہ آپ کے مواعظ اور تقریروں سے واقف ہے۔ لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، آگرہ، فیض آباد، اعظم گڑھ، بنارس، مرشد آباد، کلکتہ، رنگون، مراد آباد،

منظفرنگر، دہلی، کاٹھیاوار، لاہور، ملتان، راولپنڈی، پشاور، مدراس، ویلور، بنگلور، مسقط، مڈغاسکر، زنجبار، کشمیر، جموں، اسکردو، لداخ، تبت وغیرہ میں معرکہ آرا تقریریں فرمائیں۔ عشرت رحمانی صاحب ریڈیو اسسٹنٹ کے زمانہ میں ماہِ محرم اور دیگر مواقع پر آل انڈیا ریڈیو سے بھی آپ کی تقریریں نشر ہوئی ہیں۔

اعزازِ مُلکی

مولانائے محترم کا چونکہ اُس خاندان سے تعلق تھا جس کے سر سلطان احمد کے۔سی۔ ایس۔آئی علی اکبر کاظمی پرنسپل ٹریننگ کالج پٹنہ، موسیٰ رضا صاحب کاظمی ٹکسٹائل کمشنر آف انڈیا وغیرہ مشہور ہستیاں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اس لئے سول و ملٹری حکام آپ کی خاص عزت کرتے تھے۔ اپریل سنہ ۱۹۴۷ء میں جب آپ دہلی میں سر سلطان بالقابہ کے مہمان تھے اور دہلی کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سابق کے رواسم کی بنا پر آپ کو اپنے یہاں دعوت دی اور اپنے تصانیف مطالعہ کے لئے دیئے۔

ہر اکسلینسی سروجنی نائیڈو گورنر یو۔پی نے آپ کو کئی مرتبہ گورنمنٹ ہاؤس میں باریاب کیا اور سیاست حاضرہ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس علم نواز گوشہ نشین ہستی نے اپنے حدودِ عمل سے تجاوز نہ کیا۔

پشاور کے دورانِ قیام میں سرحد کے گورنر مسٹر کنگھم سے کئی بار ملاقات ہوئی اور اختلاف خیال میں آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہے اور اتنی خاندانی عزتوں کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ناکافی اور قلیل مشاہرہ پر شکرِ منعم اور فرائض کی ادائیگی میں دلولہ اُن

کی خاص صفت تھی۔ مال و دولت کی کبھی ہوس نہیں کی اور ایسے ذرائع کے قریب نہیں گئے۔

اخلاق

عام لوگوں کے ساتھ آپ کا خُلق و مروّت اس قدر قابلِ ذکر ہے کہ جو ایک مرتبہ آپ سے ملتا تھا اس کے دل میں آپ کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی تھی۔ غیر شیعہ حضرات کے ساتھ آپ کے خُلق ہی کا نتیجہ تھا کہ پشاور اور مضافات پشاور کے اہل سنت بھی اتنی ہی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے جتنا شیعوں میں مقبول تھے۔

اپنے ہم درس (کلاس فیلو) افراد کے ساتھ آپ بہت ہی سادگی اور غیر معمولی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مدرسہ سلیمانیہ کے ہم سبق طلبا میں نواب زادہ محمد مہدی صاحب ایم۔ ایل۔ سی، نواب علی سجاد صاحب، علی اکبر صاحب کاظمی اور مدرسہ ناظمیہ کے اہل علم و کمال میں مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ و حافظ کفایت حسین صاحب، مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ، حضرت قیس زنگی پوری کی خاص عزت کرتے تھے۔

قبول مذہب حق

مولانائے مرحوم کے تبلیغی کارناموں پر نظر کرنے سے وہ اسماء پیش کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے آپ کے روبرو مذہب حق اختیار کیا۔ ضیق وقت میں ہم تفصیل سے قاصر ہیں۔ اور جارج سالون کا نام بتا کر اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔ موصوف نے ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء کو عیسائیت سے تائب ہو کر حقانیت اسلام کا اقرار کیا اور اسلامی نام محمد جعفر

تجویز ہوا۔ (ملاحظہ ہو "الواعظ" فروری ۱۹۳۶ء)

وفات حسرت آیات

۷ شوال بروز جمعہ مطابق ۱۳ جولائی صبح کی نماز اور تعقیبات سے فراغت کے بعد سر میں درد کی شدت ہوئی، آرام کے لئے لیٹ گئے۔ ۲½ بجے صبح کو کمزوری قلب نے حالت مزاج میں زیادہ تغیر پیدا کر دیا۔ ۱۱ بجے شدید تپ اور غشی شروع ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ آفتاب علم و کمال ۸ شوال ۱۳۷۰ھ کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مرحوم نے پچپن سال کی عمر میں صرف ایک نوجوان صاحبزادہ سید ناصر حسین فخر الافاضل چھوڑے۔ خداوند عالم زیور صلاح و سداد سے آراستہ کرے۔ (الواعظ جولائی و اگست ۱۹۵۱ء)

تصانیف علامہ عدیل اختر

از جناب مولانا شیخ محمد حیدر صاحب واعظ مرحوم

۱۔ دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر

یہ کتاب اُستاد مرحوم نے مقام مجنگا مدغاسگر (افریقہ) سے واپس آکر بحالت قیام پشاور اور صوبہ سرحد ماہ جون ۱۹۲۶ء میں تالیف کی تھی۔ مرحوم نے شروع کتاب میں مشہور و مسلم کتب حضرات اہل سنت کے نام اور ان کے مصنفین کے اسماء مع سنہ ولادت و وفات تحریر فرما دیئے ہیں۔ نیز سنین طباعت و مطابع کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کی شہرت علمی دنیا میں عام ہے۔

دوران تحریر جن کتابوں سے حوالہ جات دیئے ہیں ان کے صفحات اور سطور بھی بجنسہٖ نقل کر دیئے ہیں تاکہ کسی انصاف پسند حق بین اور غیر جانب دار ناظر کو تلاش ماخذ میں زحمت و دقت اور سراسیمگی و بے اطمینانی نہ ہو۔ یہ کتاب تقریباً ایک سو آٹھ (۱۰۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں استاد مرحوم نے مختلف علوم کی روشنی میں بحث امامت و خلافت پر بے نظیر کتاب لکھی ہے۔

۲۔ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ

یہ کتاب موضوع تقیہ پر لکھی گئی ہے۔ حاشیہ پر تحریر ہے کہ اصل رسالہ ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا۔ بزمانِ قیام آگرہ تبرکاً شہید ثالثؒ کی روح سے استمداد کی غرض سے مزارِ مقدس کے متصل بیٹھ کر مسودہ نقل کیا جا رہا ہے لہٰذا انھیں کے نام پر معنون کیا جا رہا ہے۔ ضمیمہ میں مصنفؒ نے ان حضرات سے جو مذہبی مسائل میں راہِ صداقت و حق کے جویاں ہیں اُن سے خاص طور سے اپیل کی ہے کہ میری کتاب کو بغیر کسی جانب داری کے بانصاف از اوّل تا آخر دیکھا جائے انشاء اللہ پوری تسکین کا باعث ہوگی۔

۳۔ صلۂ تاریخ احمدی (مصنفہ جناب احمد حسین خانصاحب مرحوم پریانواں)

نواب صاحب مرحوم نے تاریخ احمدی لکھ کر ایک بہت بڑا سرمایہ تاریخ قوم کے سپرد فرمایا تھا۔ جن کو ملک کے ہر گوشہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ مختلف موضوعات پر کتب اہل سنت والجماعت سے عبارتیں بجنسہٖ حاشیہ پر منقول ہیں مگر کتاب میں حوالے نہیں ہیں۔ علامہ عدیل اخترؒ نے اضافہ فرما کر کتاب کے استحکام میں بے حد کدوکاوش سے کام لیا ہے اور صحیح معنوں میں تاریخ احمدی کے متعلق قوم کی اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔

چنانچہ استاد مرحوم نے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے:

"تاریخ احمدی مولفہ جناب شیخ احمد حسین صاحب اپنی خوبیوں کے سبب اس قدر جلد مشہور اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ مصنف کی زندگی ہی میں دوبارہ سہ بارہ چھپ کر تشنگانِ حقائق و طالبانِ واقعاتِ واقعی کو تشنگی دور کرنے

اور اصلیت پر پردہ ڈالنے والوں کی ظلمت کو کافور کرنے میں مسیحائی کا کام کر گئی ...... میں نے اضافوں کو اصل کتاب میں مخلوط نہیں کیا تاکہ مصنف کی محنت نمایاں رہے ..... وہ سب اضافے بطور "صلۂ تاریخ احمدی" مناسب مقام کے ساتھ حوالوں کے صفحات کے ہمراہ لکھے اور کچھ بالکل آخر میں بغرض افادہ بڑھا دیئے۔"

(عدیل اختر، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔ ۳۱؍مارچ ۱۹۴۹ء)

۴۔ فلسفۂ اسلام یا علم کلام

یہ کتاب مع ضمیمہ تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ موضوع خود عنوان کتاب سے ظاہر ہے۔ کافی جدوجہد اور تلاش کے باوجود کتاب کے اول و آخر میں کہیں زمانۂ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

۵۔ اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال

یہ کتاب علم رجال میں مرحوم نے نہایت سلیس اور آسان طرز پر لکھی ہے۔ اور مختلف مقامات پر جرح و تعدیل کے طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ ماہرین و شائقین فن رجال کے لئے ایک نادر و گراں بہا سرمایۂ علمی چھوڑا ہے۔ زیر نظر کتاب کے آخر میں استاد مرحوم نے ممدوح اصحاب رسولؐ میں بعض حضرات کے حالات معتبر کتابوں سے تحریر فرما دیئے ہیں۔ یہ کتاب ۳؍ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق ۷؍ اکتوبر ۱۹۴۹ء لکھی گئی اور تقریباً ستر صفحات پر مشتمل ہے۔

۶۔ تدلیس شبلی

استادِ علام نے تاریخ یا مناظرہ میں ایسی یادگار چھوڑی ہے جس کے متعلق وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ: "میں نے مولانا شبلی نعمانی کی تالیف کو بخوبی دیکھ کر ایسا جواب دیا ہے کہ جس پر تمام اربابِ انصاف کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ یہ کتاب بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی بڑی گرانمایہ اور مایۂ نازِ تحقیق علمی کا نچوڑ ہے۔ جو مرحوم کا عصرِ حاضر میں طرۂ امتیاز تھا۔ یہ کتاب ۱۴ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۷۔ علمی خیانتیں

یہ کتاب کسی فن سے متعلق نہیں بلکہ خود مستقل بالذات یہ ایک فن ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا خود مرحوم کو اپنی یہ تصنیف محبوب تھی۔ واقعاً انھوں نے اس گراں بہا اور اہم فریضہ سے دیگر علمائے اسلام کو ان کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے مصنف نے آخر میں مقصدِ کتاب کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جن حضرات کے پاس اس وقت اصلی کتابیں موجود ہیں ان کی خصوصی حفاظت کریں۔ جن کے پاس نہیں ہیں وہ جب حاصل کریں تو کوشش کر کے وہ نسخے حاصل کریں جو غیر محرف ہیں اور آئندہ نسلوں کے پاس یہ سند رہے کہ کتابوں میں اس طرح "علمی خیانت" کی گئی ہے۔"

۸۔ تسکین الفتن فی صلح الحسنؑ

امام حسن علیہ السلام کی معتبر اور مدلّل تاریخ ہے۔ سرسری طور پر میں نے بھی اس کتاب کو دیکھا ہے اور مرحوم کے وہ الفاظ بھی اب تک کانوں میں گونجتے ہیں جب کہ یہ فرماتے تھے:

"امام حسنؑ کے واقعات بھی واقعۂ کربلا سے کچھ کم نہیں تھے۔"

قطعات تاریخ وفات مُصنّفؒ

مرتبہ جناب مولانا سید ناصر حسین صاحب زیدی، پٹنہ

فارسی

۱۔ سال نوتنش بہ معجمہ گفتم — شد مکین ارم عدیل اخترؒ
۱۳۷۰ھ
جناب مولانا حیدر حسین صاحب قبلہ نکہت مرحوم

۲۔ چوں دلم سال رحلتش پرسید — گفت ہاتف عدیل اختر واں
۱۳۷۰ھ
جناب مولانا عبدالحسن صاحب قبلہ مرحوم

۳۔ حبّذا بخت کہ معبود بہ نفسش فرمود — وادخلی جنتی پاکیزہ زبان بندہ مومن
جناب سید میرٹھی مرحوم

۴۔ برائے سال مسیحی دہجریش زارؔ — بگو، یگانہ معصوم شد عدیل اختر
۱۹۵۱ء
۱۳۷۰ھ حروف منقوط
جناب زارؔ سیتاپوری مرحوم

اُردو

۵۔ اختر بے عدیل ڈوب گیا
جناب مہذب لکھنوی مرحوم

۶۔ اے حُسنِ عمل کی بادِ صبا — جنّت کے مسافر کیا کہنا
جناب زارؔ سیتاپوری مرحوم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

صلح کے بارے میں غلط فہمی کا سبب

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصّلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ
اجمعین وعلیٰ عترتہ وذریّتہ المعصومین ولعنۃ اللّٰہ علیٰ
اعدائھم المکذبین الضّالّین من یومنا ھذا الیٰ یوم الدین۔

واضح ہو کہ غیر مسلم تو ناواقف ہی ہیں خود مسلمانوں کو بھی اکثر اسلامی حالات و واقعات اور ان کے علل و اسباب سے لاعلمی کے سبب اس قسم کے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جو نہ صرف ذہانت کی تیزی اور حوادث پر طبع آزمائی تک محدود رہتے ہیں بلکہ ان کے اثرات نہایت دور جا پہونچتے ہیں اور اگر ان کو دور نہ کیا جائے تو بسا اوقات اتفاقی و اجماعی عقائد سے باہر ہو جانے کا سبب بن جاتے ہیں جو نہایت درجہ افسوس ناک ہے۔ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ واقعات پر رائے زنی سے پہلے غیر جانب دار ہو کر تمام پہلوؤں پر غور کر لیا جائے، عقل و نقل کے معیار پر جانچ لیا جائے، دلیلوں کی کسوٹی پر کس لیا جائے پھر کوئی رائے قائم کی جائے۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں جگر گوشوں حسن

وحسین علیہما السّلام) کی زندگی اور ان کے تمام حرکات وسکنات اس اجمال کی تفصیل کہے جانے کے مستحق ہیں جو ذات سرورِعالم میں پیچیدہ اور آپ سے وابستہ تھے (اور بہ نظر امعان دیکھنے والوں کے نزدیک یہ نہایت واضح بھی ہے) لیکن ظاہر بینی اور غیر ملک وملت کے اہل قلم کی نکتہ آفرینی کا بُرا ہو کہ بے سوچے سمجھے سادہ لوح اور ناواقف یا متعصب اور خود غرض لوگوں میں یہ زہر پھیل گیا کہ امام حسن علیہ السّلام کی صلح نازیبا تھی یا خلاف عقل وشرع تھی اور اس سے ان غیر منطقی نتائج کو چپکا دیا گیا جو کسی طرح میزان عقل میں کوئی وزن ہی نہیں رکھتے۔ اس طرح امام مسمومؑ کی ذات پر نہایت عامیانہ وجاہلانہ اعتراض کے تیر باراں کر دیے گئے۔

واقعات پر سرسری نظر ڈالنے اور اس کی اصلی غرض وغایت اور اس کے واقعی اور گہرے نتائج سے غافل رہنے کے سبب اسلامی دائرہ سے باہر رہنے والی دنیا کے علاوہ حلقہ بگوشانِ اسلام بھی بہت کچھ اس عظیم الشان قربانی کی جلالت وعظمت کے تصور میں غلط فہمی کا شکار بن گئے ہیں جو ۶۱ھ میں بمقام کربلا اپنی فقید المثال صورت سے مظلوم کربلا نے پیش فرمائی ہے۔

اس رسالہ میں مَیں نے چاہا ہے کہ صلح امام حسن علیہ السّلام کے مسئلہ پر روشنی ڈال کر بتلاؤں کہ آپ کے تمام اقدامات خواہ کسی صورت کے ہوں بالکل اسی طرح واجب الاحترام ہیں اور مطابق عقل وشرع ہیں اور ایسے ہی عظیم الشان نتائج اپنے پہلوؤں میں لیے ہوئے ہیں جس طرح جناب سید الشہداء علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے تمام اعمال وافعال میزان عقل وشرع میں نہایت موزوں و قابل ستائش

ہیں اور ان کا گہرا نقش اور دور رس نتیجہ رہتی دنیا تک ناقابلِ محو وسہو رہے گا۔ کسی مسلمان بلکہ کسی باعقل کو واقعات اور حالات کی پوری اطلاع اور جانچ کیے بغیر رائے قائم کرلینا اور اس میں تعجیل سے کام لینا ناروا اور غلط ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس مسئلہ (صلح امام حسنؑ) میں ایک خاص پیچیدگی اس لیے پیدا ہوگئی ہے کہ امامت و نبوّت کے ساتھ جمع ہونے والی حکومت اور دنیاوی سلاطین کی سلطنت کے معنی اور مقصد میں خلط مبحث کر دیا جاتا ہے اور ایک مسئلہ سیاست کا درمیان میں آجاتا ہے اور چونکہ دنیاوی حکومت کی سیاست ہی عام انسانوں کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے اکثر لوگوں کو نبوّت اور امامت کی حکومت میں بھی انھیں سطوت و جبروت کی چنگاریوں کی تلاش ہوتی ہے جو خرمن صلاح وانسانیت کو اندر ہی اندر سلگاتی رہتی ہیں اور جب بھڑک اٹھتی ہیں تو اپنے انھیں شعلوں سے اپنا کام بھی تمام کر دیتی ہیں۔

اگر امام حسنؑ، امیرالمومنینؑ اور سرورِ دوجہاںؐ کی صلح کے متعلق کوئی دنیاوی سیاست کا ماہر قلم اٹھاتا تو غالباً وہ زیادہ لکھ سکتا مگر مشکل یہ ہے کہ ایسے حضرات تو ہمہ تن عام رجحانات ہی کی خوبیوں پر نظر استحسان ڈالتے ہیں اور ظاہر ہے کہ عوام کی نظر اور ان کا رجحان طبع نقد اور فانی لذّتوں کو ترک کر کے نسیہ اور دائمی محاسن کا شیدا بننے آسان نہیں۔

اس موضوع پر میں اس نقش اوّل کو اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ اس ناچیز تحریر کے بعد کسی اور صاحب قلم کو اس امر کی طرف توجہ ہو جائے اور وہ اس سے بہتر لکھ سکے، یا احباب و ارباب علم حضرات کا نقد و تبصرہ دوبارہ اس کی

خامیوں کو درست کرادے ۔ واللہ المستعان

کتاب کے بنیادی اجزاء

اس رسالہ کے دراصل تین جزء ہیں:
پہلا ان لوگوں کی تسکین اور تشفی کے لیے جو اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں۔
دوسرا ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے جو غیر شیعہ مگر مسلمان ہیں۔
تیسرا اُن صاحبانِ انصاف و عقل کے غور کے لیے جو غیر مسلمان ہیں۔
اسی ترتیب سے اوّلاً پہلا جزء لکھتا ہوں اس کا تعلق صرف شیعہ حضرات سے ہے۔

صلح امام حسنؑ شیعہ کے نزدیک

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان نبوّت فرمانا تھا کہ سارے حجاز بلکہ روئے زمین یا یوں کہیئے کہ کل کائنات میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہوگیا۔ آپ کی تیئس ۲۳ سال کی زندگی کچھ ایسے انداز سے گزری کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ابتدائے خلقت سے جن لوگوں پر نظر پڑتی ہے آجتک کوئی نبی یا سلطان اتنی مدت اور ایسے ماحول و حالات میں اس طرح اپنے مشن کو اتنا کامیاب نہ بنا سکا اور لطیفہ یہ کہ قیامت تک کے لیے اس میں ایسا استحکام و قرار پیدا کر دیا جس کی کوئی مثال ہی نظر نہیں آتی۔ آپ کے حالاتِ زندگی آپ کے

کلمات اور فرمائشات آپ کے بتائے ہوئے طریقے اور آپ کے مقررہ کردہ پیشوا ایسے نہیں کہ جن کی مثال تاریخ عالم میں مل سکے۔ گزشتہ حالات کے سچے اور ضروری اطلاعات آئندہ حوادث کے متعلق بہترین رہنمائی و پیشین گوئی ایسی مکمل و مصدق کہ نہ سرمو فرق، نہ ریب و شک کی گنجائش، نہ ذرہ برابر گمراہی و ضلالت کا خطرہ۔ ان حالات پر نظر ڈالنے والا اگر انصاف کی نظر سے آپ کے بارہ معصوم جانشینوں کے اعمال و افعال، ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرے تو کسی کے متعلق حرف گیری کا ہرگز موقع نہیں پاسکتا۔ چونکہ اس رسالہ میں صرف امام حسن علیہ السّلام کی صلح پر بحث کرنا ہے لہذا دیگر حضرات کے حالات کی تفصیل نہیں کی جائے گی۔

کسی شخص کی ذات یا اس کے اعمال و افعال پر بحث کرنے سے پہلے اس کی حیثیت و حالات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کی یہ صلح جو زیربحث ہے تین حیثیتوں سے دیکھی جاسکتی ہے:

۱۔ شیعہ نقطۂ نگاہ سے کیونکہ آپ شیعوں کے نزدیک بارہ ۱۲ اماموں میں سے دوسرے امام معصوم اور منصوص و مفترض الطاعۃ ہیں۔

۲۔ اہل سنت کے خیال سے، اس لیے کہ اگر آپ کو اُس طرح امام نہ بھی مانیں جس طرح شیعہ کہتے ہیں پھر بھی آپ کی امامت ایک حد تک وہاں بھی مسلم ہے۔ اس کے علاوہ بہرحال آپ واجب الاحترام مسلمان، صحابی، سید شباب اہل الجنۃ اور فرزند و ریحان رسولؐ ہیں۔

۳۔ عام انسانی خیال سے، اس لیے کہ آپ عالی خاندان مسلمان ہیں۔ بانیٔ اسلام کے نواسے ہیں۔ حضرت علیؑ جو بقول شیعہ پہلے اور بقول اہل سنت چوتھے خلیفہ

تھے ان کے فرزند ہیں، جیسی کچھ سہی اور جتنے دنوں کی سہی آپ کو خلافت و حکومت ملی ہے اس لیے حاکم اور سردار فوج ہونے کی حیثیت کے مالک ہیں۔

تاریخ و حدیث کا مطالعہ صاف بتلاتا ہے کہ امام علیہ السّلام کی صلح تینوں مذکورۂ بالا حیثیت سے انتہائی دانشمندی تھی اور ایسا حکیمانہ فعل تھا جس کی خوبیاں نہ صرف آپ کی حیات تک محدود رہیں بلکہ اس مشن کو پوری طرح محکم کرنے کا ذریعہ تھی جس کا اعلان بعثت لاتمم مکارم الاخلاق اور ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکّیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین (جمعہ) اور الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبًا عندھم فی التوراۃ والانجیل یأمرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ (پ۹، ع ۹) وغیرہ کے ذریعہ ہو چکا تھا جن میں سرورِ عالمؐ کے آنے کے مقصد کو صاف صاف واضح کر دیا گیا تھا — بلکہ صلح حسنؑ نے دراصل امام حسینؑ کی آنے والی قربانی اور ذبح عظیم کی گہری تاثیر کی داغ بیل ڈالی تھی۔ چنانچہ جب اس شہادت عظمیٰ کا ٹھیک ٹھیک وقت آگیا اور حسینؑ نے بڑی آن بان سے اس امتحان میں کامیابی حاصل کر لی تو اس درخت میں ثمر آیا جو حسنؑ نے لگایا تھا اور اسلام کے بھیس میں اسلام کشی کا جو بھوت ڈھانکا اور جو بُت تراشا گیا تھا اس کا پردہ چاک ہو گیا، آنکھوں والوں پر روشن ہو گیا کہ محمدؐ و ذُرّیت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کیا چاہتے تھے اور سلطنتوں کا بہاؤ کس طرف تھا۔

امام حسن علیہ السلام کی صلح شیعہ کے نزدیک کسی طرح قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتی جو ہوا وہی عقل کا تقاضا تھا:

شیعوں کے نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ جب تک کوئی شخص معصوم اور منصوص نہ ہو اُسے امام اور جانشین رسول مانا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ امام صاحب اعجاز ہوتا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ امام کا علم وہبی ہوتا ہے حسب تعلیم خدا اور رسول علم ما کان و ما یکون بھی امام کی دسترس سے باہر نہیں۔ اب یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر کوئی شخص امام حسنؑ کی امامت کا بھی ادعا کرتا ہے اور پھر آپ کی صلح کو قابلِ اعتراض سمجھتا ہے تو اس کا تشیع کیسا ہے۔ یا تو اس نے امام حسنؑ کو امام ماننے میں غلطی کی یا امام کے فعل کو صرف معمولی حیثیت کے آدمی کے مثل سمجھا جو معصوم نہ ہونے کے سبب غلط کر سکتا ہے، یا امام کی عقل کو اپنی عقل سے کم جانا کہ ہم جس بات کو کھلم کھلا غلط سمجھ رہے ہیں معاذ اللہ امام کی سمجھ میں اتنی واضح اور سامنے کی بات بھی نہ آئی اور اس طرح نہ صرف دامنِ حسنؑ ہاتھ سے چھوٹتا ہے بلکہ رسولِ مقبولؐ اور علی مرتضیٰؑ بھی ہاتھ سے جاتے ہیں، جنھوں نے معاذ اللہ ایسا امام منصوص و منصوب کر دیا۔ اور آگے چل کر سیدالشہداء کا دامن بھی چھوٹتا ہے کہ انھوں نے ایسے امام کی اطاعت کی اور ان کو امام مانا، بلکہ چونکہ نص اور عصمت کی بنیاد اوّل خود خداوند عالم سے شروع ہوتی ہے انکار کا سلسلہ وہاں تک جا پہونچتا ہے کہ اس نے معاذ اللہ غلط انتخاب کیا اور ایسے شخص کو امام بنا دیا جو مصالحِ رعیت سے بے پرواہ اور تن آسانی کا دلدادہ اور اپنی جان بچانے کا دالہ و شیدا تھا۔ اگرچہ ایک باعقل

کے لیے اتنا ہی کافی ہے لیکن مزید اطمینان کے لیے یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ جس حسینی قربانی نے ایسا والہ و شیدا کر رکھا ہے کہ صرف مر جانا ہی خدمت دین نظر آتا ہے اور دوسری تمام دینی کوششیں کوئی قیمت نہیں رکھتیں اس کی بھی کوئی حیثیت رہ جاتی ہے یا نہیں (العیاذ باللہ) غلط کار امام کا بنایا ہوا امام یعنی امام سوم کا نامزد کردہ امام مظلوم پھر امام ہی کہاں رہتا ہے۔ اگر سنیت کے اصول سے لیجئے تو حسین علیہ السلام کے لیے نہ اجماع نہ استخلاف نہ شوریٰ نہ استیلاء۔ صرف شیعیت ہی کے قاعدہ نص و عصمت سے تو امام حسینؑ تک امامت پہونچتی ہے پھر معاذ اللہ وہ امام ہی کیا جو غلط کار کا بنایا ہوا ہو۔ اور نہ صرف بنایا ہوا بلکہ اس کا مطیع اور نہ صرف زندگی کا مطیع مرنے کے بعد تک مطیع اور نہ صرف محض اطاعت بلکہ امامت کا قائل۔ ان امور پر نظر کر کے کسی شیعہ کے لیے کیا گنجائش ہے کہ امام حسنؑ کے کسی فعل کو خلاف عقل کہہ سکے، یا معاذ اللہ یہ سمجھے کہ امام حسینؑ نے ایسے شخص کو امام مانا، یا اس کی اطاعت کو واجب سمجھتے رہے جو ڈرپوک یا عیش پرست تھا اور باوجود اس عزم و استقلال کے جس کا اظہار کربلا میں ہوا معاویہ صاحب سے نہ لڑ پڑے اور اسی کے پابند رہے جو امام حسنؑ نے کیا اور معاذ اللہ ان کی غلطی کی اپنے عمل سے تصدیق کرتے رہے۔ اگر اس موقع پر محض دنیا داری اور رشتہ داری کا لحاظ کرنا خیال کیا جائے تو اور بدتر ہو جاتا ہے، حق کے مقابلہ میں کسی اور کا خیال معاذ اللہ۔ یہ تو تھا زمانہ حیات امام حسنؑ کا ذکر، اب اور اہم موقع وہ ہے جو امام حسن علیہ السلام کی وفات کے بعد اس وقت تک کا ہے جب تک معاویہ کا انتقال نہیں ہو چکا۔ یعنی پورے دس سال۔

اس زمانہ میں حسینؑ معاویہ سے لڑ کر کیوں نہ شہید ہو گئے۔ حالانکہ امام حسن علیہ السلام کی زندگی کی بہ نسبت اب کچھ اور سختیاں بڑھ رہی تھیں۔ ایسے اسباب بھی پیدا ہوئے جن سے اشتعال ہو سکتا تھا۔ امام حسنؑ کو زہر سے شہید کرا دینا ہی ایک ایسا واقعہ تھا کہ اگر ہماری سی نظر ہوتی تو امام حسینؑ کے لیے جنگ کا اچھا خاصا بہانہ تھا اور ظاہر بین نظریں اس پر اعتراض بھی نہ کرتیں لیکن امام حسینؑ ہیں کہ گویا کربلا والے ہی نہیں۔ حالانکہ سن کی طرف غور کرو تو یہ زمانہ جلدی غصّہ اور طیش میں آجانے کا ہوتا ہے مگر عصمت کے مجسموں میں خاکی خطا کار کالبدوں کے خواص دیکھنا عدم بصارت نہیں تو فقدان بصیرت ضرور ہے۔ علیؑ بھی تو شباب کی عمر میں خونِ جگر پیتے رہے اور ساٹھ کے قریب پہونچ کر دوبارہ میدانِ جنگ میں کود پڑے اور پھر آئے تو کیسے آئے، بہرحال باوجود علم امام حسینؑ جنگ نہیں فرماتے، آخر کیوں؟ معترض صاحب کی تسکین اس سے نہیں ہوتی کہ حالات اور موقع جنگ کا نہیں ہے لہٰذا حسینؑ بھی چپ ہی ہیں اور اسی طرح خونِ جگر پی رہے ہیں جس طرح بڑے بھائی کو پینا پڑا تھا۔ زہر خورانی سے آپ کو اطلاع تھی جیسا کہ علاّمہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جلاء العیون میں لکھا ہے:

"قطب راوندی نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ امام حسنؑ اپنے اہل بیت سے فرمایا کرتے تھے کہ میں بھی زہر سے اسی طرح شہید کیا جاؤں گا جس طرح رسولِ خداؐ۔ لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کام کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا کہ میری زوجہ جعدہ بنت اشعث بن قیس۔ معاویہ اس کے پاس پوشیدہ طریقہ سے زہر بھجوائے گا

اور حکم دے گا کہ وہ مجھ کو کھلا دے۔ الخ"

(جلاء العیون حالات امام حسنؑ)

امام حسین علیہ السّلام کو اوّلاً بعقیدہ شیعہ امورِ غیبیہ میں دخل ہونا ظاہر ہے یوں بھی زہر دلانے والے کا پتہ معلوم ہوگا۔ اگر آپ ظاہر نہ فرماتے جب بھی خیال ہوتا کہ آپ پر ظاہر تھا لیکن اب تو تصریح ہوگئی۔ شیعہ اور اہل سنت مورخین و مصنفین نے جو روایات لکھے ہیں اُن سے واضح ہے کہ امام حسنؑ کو معاویہ صاحب نے زہر دلوایا۔ امام حسنؑ کے مرنے پر علی الاعلان خوشی منائی۔ آوازِ تکبیر بلند کی، سجدۂ شکر کیا۔ باوجود ان باتوں کے امام حسینؑ نے جنگ نہ کی اور معاذ اللہ (گویا) اپنی جان بچاتے رہے۔ تو کیا ہر موقع جنگ ہی کا ہوتا ہے اگر ایسا مانا جائے تو پھر امام حسینؑ پر بھی اعتراض پڑتا ہے۔

امام حسنؑ کو زہر دلوانے والے صاحب معاویہ ہیں :

مذکورہ بالا روایت شیعہ کتاب کی ہے اب ہم اہلِ سنّت کی کتابوں سے چند روایتیں نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ امام حسنؑ کو زہر دلوانے والے صاحب معاویہ ہیں اور ان کو اس پر کیسی مسرّت ہوئی ہے :

۱۔ "امام حسنؑ کو آپ کی عورت جعدہ[۱] بنت اشعث بن قیس کندی نے زہر دیا۔ اس مطلب کے لیے معاویہ نے مخفی طور پر یہ

---

[۱] جعدہ حضرت ابوبکر کی بھانجی اور اشعث بہنوئی تھا۔

چال کی تھی کہ جعدہ سے کہلا بھیجا تھا کہ اگر تو کسی حیلہ سے حسنؑ کو قتل کر دے تو میں تجھے ایک لاکھ درہم بھی دوں گا اور تیرا یزید کے ساتھ بیاہ کر دوں گا۔"

(مروج الذہب مسعودی برحاشیہ نفح الطیب ج ۲ ص ۳۸۱ طبع مصر سطر ا تا ۵)

۲۔ "آپ کو آپ کی عورت جعدہ بنت اشعث بن قیس کندی نے زہر دیا، اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ امر معاویہ کی انتہائی چالاکی سے بذریعہ اس عورت کے عمل میں آیا ہے۔"

(استیعاب بن عبد البر ص ۱۴۴ مطبوع حیدر آباد دکن)

۳۔ "معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا تو اسے حسن ابن علیؑ اور سعد بن ابی وقاص اس راہ میں نہایت گراں گذرے چنانچہ خفیہ سازش نے دونوں کو زہر دلوا کر دونوں کا کام تمام کر دیا۔"

(ابن ابی الحدید معتزلی، شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۷ اطبع مصر و ص ۴ جلد مذکور)

۴۔ "جب معاویہ کو امام حسن علیہ السلام کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی فوراً سجدۂ شکر میں گر پڑے۔"

(ابو الفداء ج ۱ ص ۱۸۲ طبع مصر۔ عقد فرید ج ۳ ص ۲۰۳ سطر ۱۹ و ۲۰ طبع مصر۔ مروج الذہب مسعودی برحاشیہ نفح الطیب ج ۲ ص ۳۴۸)

واقعہ کی تفصیل مروج الذہب اور دیگر تواریخ سے مل سکتی ہے مجمل خضرا

میں آوازِ تکبیر کا بلند ہونا ابن عباس سے اس باب میں گفتگو وغیرہ قابل ملاحظہ ہے۔

مختصر یہ کہ ان واقعات سے واضح ہو گیا کہ امام حسنؑ کو معاویہ نے زہر دلوایا مگر باوجود شہرت وعلم حضرت امام حسینؑ نے جنگ نہ کی۔ اس کے علاوہ جب امام حسنؑ کو قبرِ رسولؐ پر لے گئے اور وہ دردناک منظر پیش آیا جس پر محبانِ آل رسولؐ تاقیامت روتیں گے، بلکہ انسانیت ماتم کرے گی۔ دمُردہ کے جنازہ پر تیر باراں کیا گیا حتیٰ کہ میت کے جسم سے متعدد تیر نکالے گئے) پھر بھی امام حسینؑ نے جنگ نہ کی۔ جنگ کے لیے اب اور کیا بہانہ اور اسباب ہونے چاہئیں۔ آخر ان واقعات کا کوئی جواب ہے یا ایسے حالات میں امام حسینؑ کو بھی معاذ اللہ موردِ الزام قرار دیا جائے اس طرح امام حسینؑ کے حالات شہادت سُن کر اور امام حسنؑ کے حالات کو بغیر معلوم کیے ہوئے ایک کی تحسین اور دوسرے پر اعتراض کرنے سے "ایں ہم رفت و آں ہم رفت" کا مصداق بن جانا پڑے گا۔

مزید سامانِ تسکین:

ابھی شیعوں ہی کی تسکین کے لیے عرض کر رہا ہوں کافی تو اتنا بھی ہے مگر مزید تسلّی کے لیے اور واقعات وحالات لکھے جاتے ہیں جن سے انسان ان واقعات اور اسباب کو سمجھ لے گا جو امام حسن علیہ السّلام کے لیے باعث صلح ہوئے تھے اور جن کا خیال کر کے آپ کو خوں گلو بہانے کے بجائے خونِ جگر پینا پڑا تھا۔

مذہب شیعہ بلکہ عام عقل کا مقتضی یہ ہے کہ اوّلاً نبی یا امام کی معرفت و انتخاب میں پوری کد و کاوش کی جائے۔ عقلی اور نقلی طریقوں سے امتحانی اور امکانی آزمائش

کرلی جائے تب کسی کی نبوّت یا امامت کا اعتقاد کیا جائے پھر اس کے بعد یہ ضرور ہے کہ جب نبی یا امام معصوم و منصوص ہاتھ آجائے اب اس کے احکام و افعال میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید میں " اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم " ہے کسی وقت، زمانہ، حالت یا کام کا استثنا نہیں، ہر حالت واجب الاتباع ہے۔ (یا پھر ایسے بے اعتبار رسول یا امام کو اختیار ہی نہ کیا جائے جس کی دیانت یا ذہانت پر اپنی دیانت و ذہانت سے بھی کم بھروسہ ہو۔ سمجھنے کے لیے ایک مثال طبیب کی ہے، مریض و تیمار دار کا فرض ہے کہ علاج سے قبل ہر طرح لائق اور قابلِ اعتماد معالج معلوم کریں لیکن تشخیص کے بعد اس کے نسخہ اور بتائے ہوئے پرہیز پر چوں و چرا نہ کریں ورنہ مریض کا خدا ہی حافظ رہے گا۔ ایمان داروں کے لیے احکام رسول کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں قرآن نے اعلان عام فرمایا ہے؛

فلا و ربک لا یؤمنون	(اے رسول!) تمہارے پروردگار کی
حتی یحکموک فیما شجر	قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ
بینھم ثم لا یجدوا	اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ)
فی انفسھم حرجا مما	بنائیں (پھر بھی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرد
قضیت ویسلموا تسلیما۔	اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں
(پ ۵ ع ۲)	بلکہ خوش خوش اس کو مان بھی لیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ ایک شخص اپنے آپ کو اسی وقت ایمان دار کہہ سکتا ہے جب خدا رسول اولی الامر کے فیصلہ کو اس طرح مان لے کہ نہ صرف زبانی بلکہ دل میں بھی

کوئی خلش نہ رہے اور بالکل تسلیم کرلے۔ شیعوں کے نزدیک یہ بات محتاج بحث نہیں کہ ائمہ معصومین علیہم السّلام کی طاعت، رسول کی طاعت اور ان کی نافرمانی رسول کی نافرمانی ہے اور سمجھ میں آنے کی بات بھی یہی ہے یا تو اس کو نبی یا ولی نہ مانو یا پھر اس کی عقل اور عمل کو اپنی عقل اور عمل سے بالاتر سمجھو۔ یہ مسئلہ بھی شیعوں کا مسلمہ ہے کہ ائمہ اثنا عشر میں سے ہر ایک کی اطاعت و انقیاد بالکل ایک طرح بلکہ ایک شخص کی سی ہے جس نے ان میں سے کسی ایک کا انکار کیا اس سے خود بخود سب کا انکار ہو گیا۔

پس یہ سمجھنا چاہیئے کہ امام حسنؑ پر نکتہ چینی اور امام حسینؑ کی تحسین سے خدا، رسول یا خود امام حسینؑ راضی ہیں بلکہ ایسے شخص کو امام حسینؑ کے دربار سے بھی کوئی انعام نہ ملے گا۔ ایسا غرہ فریب نفسانی اور اغوائے شیطانی اور حیلۂ ابلیسی ہے جو عبادت و محبّت کے بھیس میں معصیت و عداوت کو نشو و نما دے رہا ہے۔ ایک شیعہ کے لیے تو یہی کافی ہے کہ امام حسنؑ امام معصوم ہیں ان کا ہر قول و فعل، حرکت و سکون میزان عصمت میں تُلا ہوا ہے اور اعتراض سے بالاتر ہے، مستحق اتباع و تحسین ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہماری سمجھ میں کسی فعل کی مصلحت یا کسی عمل کی قیمت نہ آتی ہو مگر اس سے اس کی عظمت میں کیا کمی آسکتی ہے جو بنص خدا و رسول واجب الاتباع مقرر کیا جا چکا ہے، ائمہ علیہم السلام کے اعمال و افعال کے جملہ فوائد و مصالح تک ہر نظر نہیں پہونچ سکتی۔ لیکن ہماری ناواقفیت اور کم علمی اصل جوہر کی شرافت و عظمت میں کمی نہیں پیدا کر سکتی، آئندہ جو چیزیں نقل کی جائیں گی اُن سے کچھ وجوہ و اسباب و مصالح کا اندازہ ہو سکے گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

یہی اور صرف اتنے ہی مصالح تھے۔ یہ صرف نمونہ اور اندازہ کے لیے ہیں۔

علومِ ائمہّ :

بحیثیت شیعہ ہونے کے ہمارا عقیدہ ہے اور تاریخ و دیگر کتب اہلِ اسلام ہماری تائید میں ہیں کہ ائمہ علیہم السّلام کے علوم لدنی اور وہبی تھے بذریعہ انسانی تعلیم و تعلّم عام انسانوں کی طرح کسبی نہ تھے۔ چنانچہ ہم اسی بنا پر انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو مجتہد نہیں کہتے کیونکہ اجتہاد کا نتیجہ ظنّی اور ان حضرات کے علمی پایہ سے پست ہے۔ ان کے علوم یقینی اور اجتہاد سے بلند تر ہیں۔ اس بنا پر ائمہ کے تمام افعال و اعمال صرف اُن ظاہری واقفیتوں پر مبنی نہ تھے جو عام انسانوں کے لیے ہوتے ہیں۔ بلکہ علوم کی انتہائی حقیقت کے مطابق اور ان احکام کے موافق تھے جو بذریعہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سینہ بہ سینہ انھیں بارگاہِ ربّ العزّت سے پہونچے تھے یا وقتاً فوقتاً بلحاظ مواقع و مصالح بذریعہ تحدیث والہام انھیں ملا کرتے تھے۔
علاّمہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جلاء العیون میں تحریر فرمایا ہے :

"خوب سمجھ لو کہ ائمہ ہدیٰ کی عصمت و جلالت مان لینے کے بعد یہ لازم ہے کہ ان حضرات سے جو کچھ واقع ہو اُسے صاحبانِ ایمان کو مان لینا ہی چاہیئے اور اس پر شبہ و اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ مومنین پر واضح رہنا چاہیئے کہ ائمہ جو کچھ کرتے ہیں وہ دراصل خدا کی طرف سے ہے اس پر اعتراض کرنا خدا پر اعتراض کرنا ہے۔ یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خداوند عالم نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک صحیفہ

بھیجا تھا جس پر بارہ مہریں تھیں۔ ہر امام (اپنے اپنے وقت میں) اپنی مہر توڑتا اور جو اس میں لکھا ہوتا اس پر عمل کرتا تھا۔"

علامہ مجلسیؒ کی اس تصریح کی تصدیق ائمہ علیہم السلام کے ان اعلانات سے ہوتی ہے جو واقعات آئندہ کے متعلق ان حضرات نے مختلف موقعوں پر فرمائی ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے بارہا فرمایا ہے ماکذبت و ماکُذِبت۔ اپنی شہادت کے متعلق جو خبریں دی ہیں جن میں بتلایا ہے کہ رسول اللہ ایسا فرما گئے ہیں۔ امام حسینؑ کا واقعات از ابتدائے سفر تا شہادت بیان فرمانا، خصوصیت سے شہادت گاہ کا ام سلمہ کو دکھلا دینا۔ اہلِ بیت کے ساتھ لے جانے کے لیے محمد حنفیہ سے" ان اللہ شاء أن یراھن سبایا" فرمانا۔ امام جعفر صادق علیہ السّلام کا منصور کی حکومت کی خبر دینا۔ امام رضا علیہ السّلام کا دعبل کے مرثیہ میں" وَقَبرٌ بِطُوسٍ" کا اضافہ فرمانا۔ موقع ولیعہدی پر اس کے ناتمام ہونے کا اعلان وغیرہ صاف بتلاتا ہے کہ اسباب ظاہری ہی تک محدود علوم کی پابندی نہ تھی بلکہ انھیں جو حکم جس طرح دیدیے گئے تھے وہ ناقابلِ ترمیم تھے اور عصمت کے قدموں میں دنیاوی آندھیاں لغزش نہیں پیدا کر سکتی تھیں۔

نظامِ عمل

ائمہ اہلِ بیت میں سے جس نے جو کچھ کیا وہ اپنے زمانہ میں اُن حوادث کے لیے انھیں احکام کا من عند اللہ مامور تھا" کائناً ما کان[1]" اگر سکوت

---

[1] جو کچھ بھی ہو۔

تھا تو بہ پابندی علم لدنی۔ اگر قول تھا تو بہ اتباع تعلیم الٰہی و ہبی۔ اس قاعدہ سے کوئی امام مستثنیٰ نہیں چنانچہ امام حسنؑ کی مصالحت اور جان نہ دینا بھی اس وقت ان شرائط اور ان حالات کے ماتحت ٹھیک حکم خدا و تعلیم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق اور بالکل مطابق تھا جس میں ذرا شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور امام حسینؑ کا میدانِ کربلا میں مع اپنی چھوٹی سی جماعت اعزہ وانصار دریائے خون میں ڈوب جانا بھی حرف بہ حرف باطنی تعلیمات والہامات کے مطابق تھا۔

اگرچہ واقعات گذرے ہوئے ہزار سال سے زیادہ ہو گئے، مگر تاریخیں اب بھی اپنے دامن میں ان جواہر کی حفاظت کر رہی ہیں جن سے حقیقت کا پیکر آراستہ ہو جاتا ہے۔ ظاہرداری اور ظاہر پرستی اور آجکل کی اصطلاح کا پروپگنڈا باطن بیں اور حق پرست قلوب میں اضطراب نہ پیدا کرسکتا تھا نہ کیا۔ فخری کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو:

"جب امیرالمومنین علیہ السلام خوارج سے جنگ کے لیے نکلے تھے تو خوارج کچھ جلدی جلدی آگے بڑھنے لگے، تو لوگوں کو خیال ہوا کہ خوارج پُل سے پار اُتر گئے چنانچہ لوگوں نے آپ سے آکر عرض کی کہ یا امیرالمومنین وہ لوگ پُل سے پار اُتر گئے (جلدی) ان سے مقابلہ کر لیجئے ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ دور نکل جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ تو پُل کے اسی پار قتل کیے جائیں گے، خدا کی قسم تم میں سے دس آدمی بھی قتل نہ ہوں گے اور ان میں سے دس آدمی بھی نہ

بچیں گے۔ یہ سُن کر آپ کے قول میں لوگ شک کرنے لگے۔ لیکن جب پُل کے قریب جا کر دیکھا تو یہی دیکھا کہ وہ لوگ واقعاً پُل کے پار نہیں گئے ہیں اس وقت اصحاب امیر المومنینؑ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور آپ سے عرض کی کہ یا امیر المومنینؑ! آپ کا ارشاد بجا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں ہاں (کیوں نہ ہو) قسم بخدا میں نے نہ کبھی جھوٹ کہا اور نہ مجھ سے کبھی جھوٹ کہا گیا۔ (یعنی جس نے مجھے بتلایا ہے وہ رسولؐ ہمیشہ کا صادق، امین ہی تھا)۔

(فخری مطبع رحمانیہ مصر ص ۷، ۱۳۴۵ھ)

اس واقعہ کے تفصیلات دوسرے کتب میں بھی موجود ہیں۔ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے ارشاد میں اس واقعہ کو اور ذرا تفصیل سے لکھا ہے (اس سے لوگوں کی سازش اور امتحان امیر المومنینؑ کا بھی پتہ چلتا ہے) معلوم ہوا کہ ان حضرات کے افعال صرف ظاہری شور و غوغا اور سرسری اطلاعات پر مبنی نہ تھے بلکہ ان یقینی علوم پر مترتب ہوتے تھے جو بوحی الٰہی رسولؐ تک اور بہ تعلیم رسولؐ آل رسولؑ تک پہونچے ہوتے تھے۔ اس قسم کے واقعات کتب سیر و تاریخ میں کم نہیں ہیں جن میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ غیبی تعلیم کے ذریعہ ان حضرات نے آئندہ واقعات کو بتلایا اور پھر اس پر متفرع ہونے والے احکام دیئے یا اس کے خود پابند رہے۔ مختصر یہ کہ جنگ و صلح بھی انھیں مخصوص احکام کی پابندی میں ہوتی تھی۔ اس کی مثال انبیائے سابقین میں بھی موجود ہے۔ جناب ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت نوحؑ، حضرت یونسؑ

کی کس کس طرح مخالفت کی گئی اور ان پر کیا کیا ظلم وستم کیے گئے۔ مگر ان حضرات نے جنگ کر کے جان نہ دے دی، بلکہ کبھی شہر چھوڑ کے، کبھی تقیہ میں زندگی بسر کر کے جان بچائی لیکن اپنا کام پورا کیا، اور جب نافرمانوں کے ہلاک کرنے کا وقت آگیا تو آسمان سے باراں اور تنور سے فوران شروع ہو گیا۔ "لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا" کا عمل ہو گیا۔ جناب یحییٰ و ذکریا علیہم السلام نے تہ تیغ ہونا اور زیر آرہ آکر ٹکڑے ہو جانا گوارا کیا اور اپنی بات پوری کی (وہی الٰہی مشن)، جناب عیسیٰؑ نے جنگ نہ کی، پر نہ کی (اپنا کام کر گئے)، جناب موسیٰؑ نے جب حکم پایا صف آرائی کی، ورنہ وہی موسیٰؑ تھے جو کس کس طرح چھپتے پھرتے تھے مگر ہر حال میں اپنا کام کرتے ہی رہے اور یہی کامیابی اور ان کی زندگی کا مقصد اصلی تھا۔ سچ ہے:

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

خدا کے پیارے اور اس کی طرف سے خلق خدا کی اصلاح پر مامور بندے دنیا اور اہلِ دنیا کی مدح و مذمت پر نظر نہیں رکھتے بلکہ انھیں وہ خدمت پیاری ہوتی ہے جس پر خدا نے انھیں مامور کیا ہے اور اس کی ترویج و بقا و استحکام کے لیے وہ اسی دستور العمل کے پابند ہوتے ہیں جو خدا کی طرف سے انھیں دیا جاتا ہے۔ اگر اصل خدمت ادا نہ ہوئی تو لاکھ دوسرے محسنات آجائیں سب ناقابلِ التفات۔ اور اگر اصل خدمت

ادا ہوگئی تو لاکھ چیخنے والے چیخا کریں ان کی ملامت ہیچ۔ کس مسلمان میں یہ دم ہے کہ روح اللہ کو ٹوکے کہ آپ نے موسیٰؑ کی تیغ کیوں نہ بلند کی، یا کس مسلمان کے منہ میں زبان ہے کہ کلیم اللہ سے پوچھے کہ آپ نے یحییٰؑ و ذکریاؑ کی سی مظلومی کیوں نہ اختیار فرمائی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ امام حسین علیہ السّلام کی قربانی تو مظلومی کے سبب قابلِ تحسین رہ جائے اور امام حسنؑ کی صلح باوجود ان شاندار نتائج کے جو صلح سے حاصل ہوئے صرف مرنہ جانے کے سبب قابل نکتہ چینی بن جائے۔ اگر انبیاء سابقین کے اختلاف عمل کی توجیہ، اختلاف حالات ہو سکتی ہے، تو اُن دونوں جگر گوشگان خاتم الانبیاء کے اقدامات کو بھی اختلاف وقت و ابنائے وقت سے مقابلہ کے لیے مختلف سلاح کے استعمال میں حق بجانب ہی کہنا چاہیئے۔ ایک کا وقت ایسا تھا کہ "صبرت و فی العین قذی و فی الحلق شجی اری تراثی نہبا"[1] کا منظر دیکھیں، دوسرے کا عہد یہ تھا کہ "لایبالی عمک وقع ھو علی الموت ام وقع الموت علیہ"[2] پر کاربند ہو جائے۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں وہ کیا جو چاہیئے تھا اور اس سے بہتر ممکن نہ تھا کس کی طاقت ہے کہ سیّدالشہداءؑ کی قربانی کا حق مدح ادا کر سکے اور کس کا جگر ہے کہ مظلوم مسموم کے خونِ جگر پینے پر جبر و صبر کرکے دین مبین کی حفاظت کا حق توصیف پورا کر سکے۔ اصل

---

[1] میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں خلش تھی اور حلق میں پھندے لگے ہوئے تھے۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔

[2] فکر نہیں موت مجھ پر غالب آئے یا میں موت پر غالب آؤں۔

یہ ہے کہ دونوں شہزادوں کے وقت اور ابنائے وقت میں نمایاں فرق ہے۔ حسنؑ کا سابقہ معاویہ سے تھا، حسینؑ کا قصہ یزید کے مقابلہ کا تھا۔ شیعہ، سُنی، مسلم، غیر مسلم کوئی شخص جو ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہوگا یہ نہیں کہہ سکتا کہ معاویہ و یزید کا عام مطالبہ، معاویہ و یزید کا سن، معاویہ و یزید کا حسنؑ و حسینؑ سے مطالبہ، معاویہ و یزید کی عام انسانوں سے خواہش، معاویہ و یزید کا برتاؤ، معاویہ و یزید کا مزاج، معاویہ و یزید کا کیریکٹر، معاویہ و یزید کے متعلق عام مسلمانوں کا عقیدہ، بالکل یکساں تھا۔ تاکہ مقابلہ کرنے کے لیے دونوں کے مقابلہ میں یکساں سلاح اور ایک سی سیاست صحیح ہو سکے۔

شیعوں کے سامنے ان حالات اور واقعات کی زیادہ تفصیل اس لیے ضروری نہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے اور سُنتے رہتے ہیں۔ البتہ آئندہ ابواب میں غالباً اس کی ضرورت پڑے۔ اجمالاً اگر ان مذکورہ بالا حالات کے امتیاز و تفرقہ پر نظر کر لی جائے تو بہت کچھ اشکال حل ہو جائے اور ہرگز امام حسنؑ سے کربلا کی سی قربانی کا مطالبہ اور حسینؑ سے صلحِ حسنؑ کی خواہش کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

امام حسنؑ کی صلح حضرت علیؑ اور رسالتمآبؐ کے افعال و احکام سے موید ہے

قرآن مجید اور احادیث اہل اسلام کتب تواریخ و تفاسیر نہایت وضاحت سے تقیہ کا حکم بیان کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ان سے قطع نظر کی جائے تو شیعہ تو تقیہ

سے انکار ہی نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں ایک طرف تقیہ کے جواز کا قول اختیار کرنا اور دوسری طرف امام حسنؑ کو اس کا موقع نہ دینا کس درجہ تعجب خیز ہے۔ پھر اس صلح کو اگر تقیہ کی ایک فرد کہہ دیا جائے تو اعتراض ختم ہوا جاتا ہے اگرچہ کوئی کوتاہ فہم یا ضدی طبیعت تقیہ سے خوش نہ ہو مگر دور بین اور حکمت پسند انسان تقیہ سے کنارہ کشی کر ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ تقیہ اسی وقت ہوتا ہے جب تقیہ نہ کرنے میں اس سے بڑی خرابی پیدا ہوتی ہو۔ ظاہر میں اگرچہ تقیہ کرنے والا شکست کھاتا ہے مگر واقع میں وہ اصول اور انسانیت کی فتح ہوتی ہے۔ انبیائے سابقین کی سیرت پر نظر ڈالیے، جناب ابراہیمؑ کے واقعات، جناب موسیٰؑ کے حالات کیا بتاتے ہیں، خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کیا کہتی ہے۔ قرآن واحادیث نے کس حکیمانہ رفتار کی تعلیم دی ہے کیا جا وبیجا جنگ کرنا ممدوح ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

جب ہم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر موقع جنگ کا نہیں تھا، ورنہ ہر جگہ آپ نے شمشیر زنی ہی سے کام لیا ہوتا۔ لیکن صبر وسکوت کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ جانب مخالف کی حقیقت ثابت ہو جائے۔ جبر، جبر ہی رہے گا اور صبر، صبر ہی کہلائے گا۔ غور کیجئے، جناب رسالت مآبؐ نے ابتدائً دعوت اسلامی مخفی شروع کی، جیسا کہ تواریخ اور احادیث سے روشن ہے، ابتدا ہی میں آپ نے اعلان نہ کر دیا۔ اگر ایسا کرتے تو لامحالہ مادی سامان میں غلبہ رکھنے والے کفار غالب آجاتے اور اگرچہ آپ کو شہادت کا درجہ حاصل ہو جاتا مگر اس سے زیادہ اہم اور

ضروری مسئلہ جو آپ کی غرض بعثت تھی یعنی تتمیم مکارم اخلاق و ترویج دین اسلام وہ آپ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا اور آپ اپنے مشن میں پوری طرح ناکامیاب ہو جاتے۔ چاہے کوتاہ نظر کہہ بھی لیتا کہ آپ بڑے نڈر تھے بڑے بہادر تھے، سارا عرب ایک طرف آپ نے اکیلے اپنی بات کا اعلان کر کے جان دے دی۔ لیکن کیا یہ واقعی قابلِ تحسین امر ہوتا، ہرگز نہیں بلکہ مشن کی ناکامیابی پر تو کوئی نڈر اور بہادر بھی مشکل ہی سے کہتا البتہ نافہم اور ضدی کہا جاتا۔ ابھی تو یہ پہلی منزل تھی جس نے بتایا کہ جنگ نہ کرنا ہر جگہ معیوب نہیں۔ جنگ نہ کرنے والا ہر موقع پر باطل پرست نہیں ہوتا۔ جنگ نہ کرنے سے مدمقابل کی حقیقت ثابت نہیں ہوتی۔ جنگ کر کے جان دیدینے کے مقابلہ میں مشن (ہدایت و تبلیغ دین حق) کی کامیابی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر جنگ نہ ہو اور اس طرح مشن کامیاب ہو جائے تو جنگ نہ کرنا اور مشن کو کامیاب بنانا دانائی اور پیروی سنت رسولؐ ہے۔

اس سے زیادہ واضح اور مشرح آنحضرتؐ کے احکام ہجرت حبشہ اولیٰ اور ہجرت حبشہ ثانیہ ہیں کہ آپ نے کفار کے تغلب و ایذا رسانی سے تنگ آکر مسلمانوں کو ایک نصرانی بادشاہ کی پناہ میں بھیجا لیکن اتنے حضرات کو لیکر جنگ نہ کی۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حبشہ میں مہاجرین کی تعداد تین سو تک پہونچ گئی تھی، اور حیات القلوب میں ہے کہ علاوہ عورتوں کے اور بچوں کے صرف مردوں کی تعداد ۸۲ تھی جس کا مطلب بھی تقریباً اسی حد تک پہونچتا ہے۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی تھے جو مکہ ہی میں رہ گئے تھے باوجود

اتنی تعداد کے جس میں حضرت علیؑ، حضرت جعفر طیار، عبداللہ بن مسعود، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوبکر، عثمان بن عفان، عثمان بن مظعون ایسے ایسے لوگ شامل ہیں یعنی ظاہراً مددگاروں کی بھی کمی نہیں (ان میں کچھ شیعہ سنی دونوں کے خیال کے مطابق کچھ خاص خاص عقیدہ کے لحاظ سے بڑے اہم لوگ موجود ہیں اور سب کے نام نہیں لکھے جاتے۔ ظاہر ہے کہ تین چار سو آدمیوں میں سے ابھی اور بہت سے نبرد آزماؤں کے نام باقی ہیں ــــ اب فرمائیے، کیا رسالت مآبؐ کا جنگ نہ کرنا جان نہ دے دینا کسی شیعہ مسلمان بلکہ کسی باعقل غیر مسلم کے نزدیک بھی قابل ملامت ہو سکتا ہے؟ آخر امام حسنؑ کا جان نہ دینا کیوں قابلِ ملامت ہے، درآنحالیکہ آپ کے مددگاروں کی تعداد بالکل محدود بلکہ بمقابلہ دشمن مفقود تھی۔ جس کی تفصیل کتب سیر و تواریخ میں موجود ہے۔ جو تاویل سرور کائناتؐ کے جنگ نہ کرنے کی ہو سکتی ہے وہی امام حسنؑ کے لیے بھی حاصل ہے۔ (یہ شبہ نہ ہو کہ مہاجرت حبشہ کی تعداد بالکل ہی کچھ حیثیت نہ رکھتی تھی کیونکہ جب ہم اسلام کی سب سے پہلی اور نہایت اہم جنگ پر نظر ڈالتے ہیں تو باوجود دشمن کی بہت بڑی تعداد کے بدر میں مسلمان صرف ۳۱۳ ہی تھے۔)

ذرا اور بڑھیے ۶ بعثت میں رسول صلعم دارِ ارقم میں پناہ لیتے ہیں یہ وہ وقت ہے کہ علاوہ ان مہاجرین حبشہ کے مسلمانوں کی تعداد ۳۹ مردوں کی ہے ان میں حضرت حمزہؑ اور عمر صاحب بھی داخل ہیں (شیعہ و سنی دونوں آنکھوں سے دیکھیے) لیکن رسول خداؐ ہیں کہ جنگ نہیں کرتے اور دار ارقم میں چھپے بیٹھے ہیں (امام حسن پر اعتراض کرنے والے بہادری اور جُبن کے معانی پر غور کر کے

جواب رکھتے ہوں تو عنایت کریں۔)

کفار مکہ نے تذلیل کی، رسوا کیا، ہر قسم کے مظالم کیے، مگر آپ نے جنگ نہ کی

یہ خیال نہ ہو کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اتباع پر کوئی تشدّد تو تھا نہیں نہ انھیں ذلیل و رُسوا کیا جاتا تھا، نہ قتل و غارت کی نوبت تھی، نہ بدسلوکی و بدزبانی تھی۔ پھر کیوں لڑتے؟ اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے ایسے عظیم مصائب توڑے جاتے جس کی حد نہیں مگر ان سب ظاہری ذلتوں کو برداشت کیا جاتا ہے لیکن جنگ نہیں کی جاتی بلکہ اصل مطمح نظر پیش نظر رہتا ہے۔ آخر اس وقت کیوں نہیں یہ سوال کیا جاتا کہ ایک بہادر اور بہادر بھی کیسا، علی کا استاد ایک غیرت مند اور غیرت مند بھی کیسا جس سے عالم نے غیرت کے سبق سیکھے۔ اعزّہ و احباب، اعوان و انصار کے ہوتے ہوئے کیوں نہیں آن کی آن میں سب کو فنا کر دیتا، یا خود لڑ کر جان دے دیتا اور (خاکم بدہن) اس طرح کی بے غیرتی یا صبر و سکوت گوارا کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے حالات اہل اسلام۔ غریب مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم کیے جاتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ کفار ان لوگوں کو گرم ریت پر دھوپ میں سُلاتے، گرم پتھر جسم پر باندھتے، دھوپ میں لوہے کی زرہ پہناتے، دُرّے مارتے، کھانا پانی بند کر دیتے۔

چنانچہ حضرت عمار یاسر اور ان کے والدین پر جو ظلم ہوا اس سے روح لرزتی ہے اور تن بدن کانپ اٹھتا ہے۔ ایک دن عمار یاسر، ان کے والدین اور ہمشیر کو گرم ریت پر لٹا دیا تھا اور مارتے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

دیکھا اور فرمایا اے آلِ یاسر صبر کرو کہ تمھاری وعدہ گاہ جنّت ہے۔ آخرکار ابوجہل مردود نے سمیہ مادرِ عمّار کو نیزہ چبھو کر ہلاک کر دیا اور یاسر کو اتنا مارا کہ جاں بحق ہوگئے۔ صہیب و حباب وغیرہ نے بھی اذیتیں اٹھائیں۔ حضرت عمر اپنی لونڈی کو اسلام قبول کرنے پر اتنا مارتے تھے کہ تھک جاتے تھے اور پھر دم لے کر مارنے لگتے تھے۔ اپنی بہن کو تو اس طرح مارا تھا کہ لہولہان ہوگئی تھیں۔ ابوجہل نے اپنی کنیز کو اتنا مارا کہ اندھی ہوگئی۔ بلال کے آقا نے غلاموں کو حکم دیا تھا کہ صبح کو دن چڑھے ببول کے کانٹے بلال کے بدن میں چُبھو دیا کرو اور جب آفتاب خوب گرم ہو تو ان کو دھوپ میں لٹا کر از سرتاپا گرم پتھر رکھا کرو تاکہ ہل نہ سکیں اور گرداگرد خوب آگ جلا دیا کرو کہ خوب جلیں۔ اور جب شام ہو ہاتھ پیر باندھ کر اندھیری کوٹھری میں قید رکھو اور باری باری تازیانے مارا کرو اور صبح تک یہی کام کیا کرو۔ اسی طرح ایک مُدّت گزری مگر حضرت بلال پکار پکار کر احد احد کہا کیے۔ (دیکھو تاریخ اسلام)

خود آنحضرتؐ کے ساتھ بھی ایسی بدسلوکیاں کی جاتیں کہ آپ نے خود فرمایا ہے: ما اوذی نبی کما اوذیت۔ آپ کو مجنوں کہتے، ساحر، کاہن اور ازیں قبیل کیا نہیں کہا جاتا۔ جب راہ سے گزرتے تو قریش کہتے کہ یہ شخص بھلا چنگا تھا دفعتہً دماغ پھر گیا۔ آپ کی گزرگاہ میں آپ کے گھر کے قریب گندگی ڈال دی جاتی، کانٹے بچھائے جاتے۔ جو شخص مکّہ میں آتا اس سے کہا جاتا کہ محمدؐ کی بات نہ ماننا، غرض ہر طرح کی اذیتیں دی جاتیں، حضرتؐ حرم کعبہ میں آتے جب بھی ستانے والے باز نہ آتے وہاں بھی ستایا جاتا، آوازے کسے جاتے، حتّیٰ کہ ایک روز عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں پھندا ڈال کر گلا تک گھونٹا، بروایت خمیس و روضۃ الاحباب

وغیرہ۔ (یہ روایت بخاری، مسند احمد بن حنبل، صواعق محرقہ، تفسیر کشاف میں بھی ہے)۔ اس پر حضرت ابوبکر نے رونا پیٹنا شروع کیا تو وہیں کفار نے ان کو ڈاڑھی پکڑ کر اتنا مارا کہ سر پھوٹ گیا۔ جب آنحضرتؐ بازار جاتے تو لوگ چھیڑتے طعنہ زنی کرتے۔ جب وعظ فرماتے تو شور و غل مچاتے۔ تالیاں بجاتے، بیہودہ گیت گاتے، خاک پھینکتے۔ آپ خانۂ کعبہ میں نماز پڑھ رہے ہیں، سر بسجدہ ہیں کہ آپ پر اونٹ یا گوسفند کی اوجھڑی ڈال دی گئی ہے، (اس طرح عبادت تک کی اہانت ہو رہی ہے) غرض کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا مگر آپ برابر صبر و سکوت کرتے رہے۔ بروایت حیات القلوب آپ نے حضرت خدیجہ کے گھر میں پناہ لی ہے اور کفار باہر سے سنگ باری کر رہے ہیں، اور حضرت علیؑ و خدیجہؓ آپ کے سینہ سپر ہیں۔ (اس صبر آزمائی کی مدت اور امام حسنؑ کی صبر کی مدّت کا بھی مقابلہ کرو)۔

ان تمام حالات پر غور کرو، اس سے زیادہ کیا سختی، ذلّت و رسوائی، اور ظلم تشدّد ہو سکتا ہے۔ پھر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے زیادہ بہادر غیرت مند کون ہو سکتا ہے۔ پھر بھی آپ کا جنگ نہ کرنا اور اس پر صبر و سکوت (پھر نہ ایک نہ دو برس، بلکہ اپنی مدت رسالت کا آدھا سے زیادہ زمانہ تک جنگ نہ کرنا)، جو لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں اُن کا گھٹ گھٹ کے مر جانا، قید و بند، تشنگی، گرسنگی برداشت کرنا دیکھتے ہیں مگر نہ لڑتے ہیں نہ جان دیتے ہیں۔ پھر آخر امام حسنؑ کا جنگ نہ کرنا کس طرح محل ایراد و اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر رسول کے لیے صبر و سکوت ظاہری ذلّت و رُسوائی کا برداشت کر لینا، اپنے ساتھ اور دوسرے مومنین کا بھی اذیتیں اٹھاتے دیکھنا اور کچھ نہ بولنا

جائز ہے تو امام حسنؑ کے لیے بدرجۂ اولیٰ جائز ہے۔

یہ حالات نبوت کے چھٹے سال تک کے تھے۔ ساتویں اور آٹھویں سال میں شعب ابی طالب کی قید، اللہ اکبر وہ مصیبت عظمیٰ تھی جس کی انتہا نہیں (جو ہجرت حبشہ میں نہیں گئے تھے وہ) تمام بقیہ اعزہ و انصار سمیت اس طرح قید ہونا کہ نہ کسی سے لین دین ہو سکے، نہ خرید و فروخت، نہ باتیں ہو سکیں، نہ ملاقاتیں، ساری رات حضرت ابوطالب خود بہ نفس نفیس پہرہ دیتے ہیں، رسولِ خداؐ کو ایک جگہ سُلاتے ہیں، کچھ رات گزرنے پر وہاں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے جا کر سُلاتے ہیں اور رسولؐ کی جگہ پر علیؑ کو سُلا دیتے ہیں۔ اسی طرح ادل بدل میں رات گذاری جاتی ہے، پھر سارا دن اولادِ ابوطالب پہرہ دیتی ہے اور اسی طرح برسوں گذارنا پڑتے ہیں۔ یہاں تک نوبت پہونچی تھی کہ رات کو بچّوں کی فریادوں سے کفار کی نیند بھی حرام ہو گئی۔ سب کچھ ہوا مگر نہ حضرت نے جنگ کی نہ جان دے کر مرتبۂ شہادت حاصل کیا۔ آخر وہ وقت آیا کہ بغیر جلا وطنی چارہ نہ رہا۔ ہجرت مدینہ کی ٹھہری اس تمام دوران میں مصائب کا سلسلہ کچھ بڑھتا ہی گیا، انصار میں اضافہ ہوتا رہا امر حق بڑھتا گیا، اشاعت دین ہوتی گئی مگر جنگ نہ ہوئی (خاکم بدہن) گھر چھوڑ کے بھاگنا پڑا۔ ہجرت گوارا کی مگر لڑکے مرجانا منظور نہ ہوا۔ (اس کو بہادری کے خلاف کہا جائے، غیرت کے خلاف سمجھا جائے، جان چرانا کہا جائے یا یہ کہا جائے کہ اذیتیں برداشت کرتے ہوئے دینِ حق کی اشاعت کو مقدم کرنا۔ یہی اصل شجاعت ہے اور غیرت شرعیہ کا یہی مقتضی ہے اور دین کی تعلیم و ترویج

ہی سب سے زیادہ قیمتی ہے) اب بہ نظر غور امام حسنؑ کے صبر و سکوت کو ملاحظہ کیجئے اور رائے دیجئے۔ کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں، اگر عقل و انصاف کوئی واقعی چیز ہے تو یہ بالکل واضح ہے کہ جس طرح کفار کے ظلم سہتے رہے اور دین رسول بڑھتا گیا ٹھیک اسی طرح دین اہل بیت (جو حقیقی دین رسول ہے) امام حسنؑ کے ظلم سہنے کے زمانہ میں اندر اندر جڑ پکڑتا گیا جو جنگ کر کے مر جانے میں امام حسنؑ کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا۔ تاریخیں اور خصوصاً محبان اہل بیت پر مظالم کی تاریخیں اس کی شاہد عادل ہیں، اور آگے بڑھئے تو ان واقعات سے اور زیادہ توضیح و تائید جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صلح حدیبیہ ہے۔

صلح حدیبیہ:

ہجرت کا چھٹا سال ہے، ذیقعدہ کا مہینہ، سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رات کو خواب دیکھتے ہیں اور صبح کو مکہ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، مہاجرین و انصار بھی ساتھ ہو لیتے ہیں، ڈیڑھ ہزار مسلمان ساتھ ہیں، منزلیں طے ہوئیں، اب مکہ بہت قریب رہ گیا۔ اُدھر کفار کو خبر ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ اتنے آدمیوں کے ساتھ آ رہے ہیں، چنانچہ وہ مزاحمت پر آمادہ ہو گئے۔ ادھر آپ کو اطلاع ملی، بس آپ نے مکہ سے ایک منزل ادھر ہی چاہِ حدیبیہ پر ڈیرہ ڈال دیا، طرفین سے ایلچی آنے جانے لگے۔ مگر کچھ ایسا سامان ہو گیا کہ جنگ کی تیاری ہونے لگی۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیعت لینا شروع کی۔ ایک درخت کے نیچے یہ رسم ادا ہونے لگی (اسی کو بیعت رضوان یا بیعت شجرہ

بھی کہتے ہیں۔ ان بیعت کرنے والوں کو اصحاب سمرہ بھی کہتے ہیں، خلاصہ یہ کہ یہ اقرار ہوا کہ نہ بھاگیں گے نہ لڑائی سے کبھی منہ موڑیں گے۔ چنانچہ چودہ سو یا پندرہ سو پچیس آدمیوں نے بیعت کر لی۔ اب جنگ شروع ہونے کو باقی ہی کیا تھا کہ سہیل کو قریش نے صلح کا پیغام لے کر بھیجا، آپ نے اس دعوت کو رد نہ فرمایا اور بجائے اس کے کہ آپ اتنے معاہدہ کر چکنے والوں کو لے کر لڑ جاتے اور یا توجہ ہی کر لیتے یا پھر شہادت ہی نصیب ہوتی، صلح پر آمادہ ہو گئے۔

"چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالبؑ کو بلا کر حکم دیا کہ لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اس پر سہیل نے کہا کہ ہم اس کو نہیں جانتے باسمک اللّٰھم لکھو۔ چنانچہ یہ لکھا۔ پھر فرمایا کہ اس طرح لکھو کہ یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو نے مصالحت کی ہے۔ اس پر سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو رسول خدا ہی جانتے تو آپ سے جنگ کیوں کرتے البتہ اپنا اور اپنے والد کا نام لکھوائیے۔ رسولؐ نے فرمایا کہ اچھا لفظ رسول اللہ کو مٹا دو۔ اس پر حضرت علیؑ نے عرض کی "رسول اللہ" تو مجھ سے کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ تب آپؐ نے خود کاغذ لے لیا اور "رسول اللہ" کی جگہ "محمد بن عبد اللہ" لکھ دیا، اور فرمایا کہ اے علیؑ! ایک دن تم کو بھی ایسے معاملہ میں مبتلا ہونا پڑے گا۔" (تاریخ کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۷۷، طبع مصر)

اس صلح نامہ کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱۔ میعاد صلح دس برس ہو گی، اس اثنار میں کوئی فریق دوسرے کی جان

مال سے تعرض نہ کرے گا۔

۲۔ فریقین کے ہم عہد بھی اسی معاہدہ میں شامل ہوں گے۔

۳۔ اس سال اہل اسلام عمرہ بھی نہ کرنے پائیں گے۔

۴۔ آئندہ سال سے مسلمان عمرہ کر سکیں گے۔

۵۔ جب مسلمان عمرہ کے لیے آئیں تو اپنے ساتھ اسلحہ نہ لائیں صرف تلوار مستثنیٰ ہے مگر وہ بھی نیام کے اندر رہے گی۔

۶۔ مسلمان حرم میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں گے۔

۷۔ کفار میں سے اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس بھاگ جائے تو واپس دیا جائے گا۔

۸۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھاگ کر کفار سے جا ملے تو وہ واپس نہ کیا جائے گا۔ (دیکھو تاریخ ابن خلدون وغیرہ)

صلح ہو گئی اور رسالت مآب کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں عام آنکھیں بھلا کاہے کو دیکھ سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ صلح (حضرت حسنؑ کی صلح کی طرح) مسلمانوں کو اس درجہ ناگوار گذری کہ لوگوں کے قدم ڈگ گئے اور حضرت عمر کے متعلق تو بخاری میں اس طرح لکھا ہے:

"عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ اس وقت میں نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کیا آپ سچے رسول نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں۔ میں نے کہا پھر کیا ہم لوگ حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ آپ نے جواب دیا کیوں نہیں۔ تب میں نے کہا کہ پھر

کیوں ہم دین میں ایسی ذلّت و رُسوائی گوارہ کریں؟ آنحضرتؐ نے جواب دیا کہ سنو بات یہ ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، اُس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے۔"

(بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب پارہ ۱۱، ص ۳۸۰، مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی۔ مناہج (ترجمہ مدارج النبوۃ) جلد دوم، ص ۲۳۶ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔

اسی کے متعلق عمدۃ القاری شرح بخاری اور روضۃ الاحباب جلد دوم، ص ۳۵۸ مطبوعہ تیغ بہادر لکھنؤ ۱۲۹۷ھ میں اس طرح ہے: لقد دخلنی امر عظیم و راجعت النبی صلعم مراجعۃ ما راجعتہ مثلہا قط (اس دن میرے دل میں ایسا دغدغہ عظیم داخل ہو گیا اور میں نے پیغمبر کے ساتھ ایسی رد و کد کی جیسی اس سے قبل کبھی نہ کی تھی۔) بعض کتابوں میں شککتُ بھی ہے۔

"ابھی صلح نامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابو جندل بن سہیل پا بہ زنجیر آ گیا۔ اصحاب کے دل میں صلح دیکھ کر اس حد کی بدگمانی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ ہلاک (گمراہ) ہو جائیں کیونکہ رسولؐ کے خواب سے (غلط تعبیر خیال کر کے) سبھوں کو اسی سال فتح کا خیال ہو چکا تھا۔ ادھر ابو جندل کو گرفتار دیکھ کر اس کا باپ بول اُٹھا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے اور آپ کے درمیان معاملہ

طے ہو چکا ہے (یہ مجھے واپس ملنا چاہیئے) آپ نے فرمایا کہ تو سچ کہتا ہے۔ آپ اسے قریش کی طرف واپس کرنے لگے تو وہ چیخ اٹھا کہ مسلمانو! مجھے مشرکین کی طرف اس لیے بھیج رہے ہو کہ وہ پھر مجھے بے دین کر دیں۔ اب کیا تھا لوگوں کے دلوں میں جو آگ بھڑک رہی تھی اُس میں شعلے بلند ہونے لگے آخر رسولؐ نے فرمایا، اے ابو جندل! صبر کر، بے قرار نہ ہو خداوند عالم تیرے اور تیرے کمزور ساتھیوں کے لیے کشائش اور مخلصی کی راہ نکالنے والا ہے۔ چونکہ قوم مخالف سے عہد کر چکے ہیں اب ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے"۔

(کامل ابن اثیر جلد ۲، ص ۷۷ مصر)

"پس عمر بن الخطاب از جائے خویش برجست و با ابو جندل می رفت و می گفت . . . . وا و را بہ سبیل تعریض و کنایت تحریض می کرد برآنکہ پدر را بکشد دآں صلح درہم نوردد . . . . لاکن وے بکشتن پدر بخیلی نمود"۔ (روضۃ الاحباب ص ۳۵۷ و ص ۳۵۸ ج دوم مطبوعہ تیغ بہادر لکھنؤ ۱۲۹۷ھ وطبری ج ۳ ص ۸ طبع مصر)

خلاصہ یہ کہ صلح ہو گئی اور نہ ٹوٹی اور انھیں شرائط پر ہوئی جو اوپر بیان ہوئی۔ کیا کوئی مسلمان جرأت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ رسولؐ کی ملامت کرے اور صحابہ کی اتنی تعداد اور پھر موت پر سب کی بیعت کے باوجود عبادت حج نہ بجالانا اور ایسی دبی ہوئی شرطوں کی صلح اور ظاہراً ایسی بزدلی یا تن پروری دکھلانا اور لڑکے جان نہ دے دینا کہلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

بجائے کسی اور تصریح کے ہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ امام حسنؑ کی صلح کو قابلِ اعتراض جاننے والے اور آپ کی امامت میں اس طرح شک کرنے والے یا صلح کو غلط یا بے جا خیال کرنے والے شیعہ حضرت عمر کا سا حال رکھتے ہیں اور ان کے جواب میں حضرت رسالت مآب کی طرح امام حسنؑ کی طرف سے یہی کہا جائے گا کہ میں وصی رسول خدا ہوں۔ ولست اعصیہ وھو ناصری (چنانچہ دونوں صلحوں کی ظاہری کمزوری کوئی چیز نہیں ٹھہری۔ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں صلحیں شان دار کامیابی اور فتح مبین ہو کر رہیں)۔

صلح حدیبیہ میں جو ۶ ھ میں کی گئی اس قدر عدد و مدد کے ہوتے ہوئے جنگ نہ کرنے اور بظاہر دبی ہوئی (اور بقول حضرت عمر کے دین کو ذلیل کرنے والی) صلح کر لینے سے وہ شان دار نتائج رونما ہوئے جو کسی صاحب ہوش سے مخفی نہیں۔ ان لوگوں کو جو امام حسنؑ کی صلح پر اعتراض کرتے ہیں شرط ہفتم وہشتم پر خصوصاً نظر ڈالنا چاہیئے۔ اتنی دبی ہوئی تو کوئی شرط امام حسنؑ کے یہاں نہیں ملتی بلکہ روضۃ الاحباب جلد اوّل ص ۲۵۶ میں تو یہ الفاظ ہیں: "در روز صلح حدیبیہ ہر شرطے کہ سہیل می کرد حضرت قبول می کرد"۔ امام حسنؑ کی صلح پر بعض لوگوں نے مذل المومنین کہا ہے مگر اور کوتاہ بیں اس کو نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں لیکن اگر سرور کائناتؐ کی صلح پر فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا کہنا رسولؐ کے فعل کو غلط یا باعثِ توہین دین نہیں ہونے دیتا اسی طرح امام حسنؑ کو مذل المومنین کہہ کر خطاب کرنا آپ کے فعل کو باعثِ توہین ایمان و اہل ایمان نہیں بنا سکتا۔ امام حسنؑ کے فعل پر اظہار اضطراب و استعجاب کی کیا وقعت ہو سکتی ہے جب خود

سرور دوجہاں کا فعل باوجود اپنی رسالت تک یاد دلانے کے شکوک میں کمی نہ پیدا کرسکا۔ فعل رسولؐ سے اصحاب اس درجہ رنجیدہ اور غیر مطمئن تھے کہ رسالت میں شک کی نوبت آگئی۔ یہ کہنا پڑا کہ انی رسول اللہ یہ کہنا پڑا کہ لست اعصیہ یہ کہنا پڑا کہ "من فرستادۂ خدا ئم و بے فرمان وے نمی کنم و وے ناصر و معین من است و مرا ضائع نخواہد گزاشت"۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم ص ۲۱۲ مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۱۴ء) لیکن با ایں ہمہ اطمینان پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ جب اصحاب کی مرضی کے بالکل خلاف (اور خدا کی مرضی کے مطابق) صلح مکمل ہوچکی اب جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ تو کیسے جاتے وہیں مقام حدیبیہ پر ھدی (قربانی) ادا کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ یہیں سے قربانی کرکے بال منڈوا کے مدینہ واپس چلو اور تین مرتبہ پے در پے یہی حکم دیا۔ مگر یاروں کی خواہش تو کچھ اور کہہ رہی تھی، کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ حکم کی تعمیل کوئی کیوں کرتا۔ چنانچہ آپ کو کمال ملال ہوا اور ام المومنین حضرت ام سلمہ سے اپنے اصحاب کی شکایت کی۔ چنانچہ انھوں نے عرض کی کہ پہلے آپ اپنا اونٹ قربان کردیں اور سر منڈالیں پھر آپ کو دیکھ کر (غالباً) وہ لوگ ایسا کریں۔ چنانچہ حضرت نے اپنا اونٹ قربان کیا تب جاکے اصحاب نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن (پھر بھی)، کمال ملول و محزون تھے اور قریب تھا کہ کثرتِ غم سے ہلاک ہوجائیں یا ایک دوسرے کو مار کر مرجائیں۔ (دیکھو تاریخ اسلام جلد ۲ ص ۱۱۷ مطبوعہ دہلی ۱۳۳۱ھ و تاریخ طبری ص ۸۰ جلد سوم طبع مصر) آنحضرتؐ کے عمل کے باوجود پھر بھی سب نے حلق[1] پر عمل نہ کیا بلکہ تقصیر[2] ہی کے عامل رہے جیسا کہ

---

[1] سر کا بال مُنڈانا [2] ناخن کاٹنا یا بال کترنا

طبری جلد سوم ص ۸۱ سے واضح ہے۔ ایک شیعہ کو غور کرنا چاہیئے کہ حدیبیہ کی صلح پر اعتراض کرنے والوں پر اعتراض کرنا اور امام حسنؑ کی صلح پر اعتراض کرنے والوں کی فہرست میں داخل ہونا بقول شخصے یک بام و دو ہوا کا مصداق ہوتا ہے کہ نہیں۔ اس صلح پر نظر رکھتے ہوئے صلح حسنؑ کو سمجھنے کی کوشش کرو اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔ ذرا انصاف سے کام لینا چاہیئے۔ سرور کائناتؐ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار یا اس سے بھی کچھ اوپر اصحاب موجود تھے اور وہ جنھوں نے مرنے کی بیعت، جنگ سے منھ نہ موڑنے کا معاہدہ کیا تھا۔ مگر رسالت کی آنکھیں دوربین تھیں۔ لڑنے، مرنے مارنے پر صلح کرنے کو ترجیح دی گئی اور صلح بھی دب کر۔ اس حد تک کہ جو مسلمانوں میں پناہ لے وہ واپس کیا جائے، جو کفار میں پھنس جائے وہ مسلمانوں کو واپس نہ ملے، اوّلاً تو اس سال حج ہی نہ کریں۔ آئندہ آئیں بھی تو تین دن سے زیادہ نہ رہیں اور پھر رہیں بھی تو سلاح نہ ہو۔ ایک تلوار مستثنیٰ بھی ہو تو وہ بھی نیام سے باہر نہ رہے۔ کیا امام حسنؑ کی صلح کی کوئی شرط اتنی دبی ہوئی دکھائی جاسکتی ہے؟۔ اب دوسری طرف امام حسنؑ کی حالت دیکھیئے، کچھ تو ایسے منافق تھے جو نہ صرف امام پر ظاہر تھا بلکہ لوگ ان کو کھلم کھلا پہچانتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو نمایاں نہ تھے مگر امام بار بار اُن کی تنبیہ اس طرح فرماتے تھے کہ میرے بیشتر میرے پدر بزرگوار کے ساتھ جو مجھ سے بہتر تھے تم لوگوں نے جو سلوک کیا ہے وہ ظاہر ہے، اور ان لوگوں کا ذکر تو بیکار ہی ہے جنھوں نے صرف اتنی سی جھوٹی آواز سُنی کہ قیس مارے گئے اور امام پر ٹوٹ پڑے اور آپ کو لوٹ لیا بلکہ حملہ کر دیا جس سے آپ بُری طرح زخمی ہوگئے، اور حالات کی تفصیل آگے آتی ہے۔ صلح کو غلط اور جنگ کی رائے دینے

والے شیعہ امام حسنؑ کو ایسے ہی ایمان داروں کو لے کر جہاد کی رائے دیتے ہوں تو یہ اُن کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ دانشمندی تو صلح ہی میں نظر آتی ہے۔ پھر امام حسینؑ کی طرح لڑ کر جان دینے کا مشورہ دیتے وقت اُن بہتّر جاں نثاروں میں سے کسی ایک کی نظیر تو حسنؑ کی فوج میں پیش کرو جنھیں حسینؑ نے مرنے سے قبل ہی یہ سند عطا فرمادی تھی فانی لا اعلم اصحابا اوفی ولاخیرًا من اصحابی[1]۔ پھر دونوں شہزادوں کے لیے ایک حکم کیا انصاف ہے؟۔ اِدھر وفاداری منزلت عظمیٰ اور اُدھر غداری کی پستی و تمغہ۔ پھر امام حسنؑ کے لیے اصل دین کو زندہ رکھنا اور اُس امانت کو آگے آنے والوں تک پہونچانے کے لیے بجز صلح کیا چارہ ہوسکتا تھا۔

فوائد صلح حدیبیہ:

اس صلح کو خداوند عالم نے صلح نہیں بلکہ فتح مبین فرمایا ہے۔ چنانچہ سرورِ عالمؐ اس صلح کو انجام دے کر واپس ہو رہے ہیں تو خدا کو اپنے محبوب کی یہ بامحل مصالحانہ روش ایسی پسند آئی کہ جبرئیلؑ کے ہاتھوں انا فتحنا لک فتحًا مبینًا کی سند بھجوائی۔ اوّلاً تو مسلمان آئے دن کی جنگوں اور قریش اور مکہ والوں کی چھیڑ چھاڑ سے نپٹنے نہیں پاتے تھے۔ اب موقع مل گیا کہ اکٹھے دس سال تک کا اطمینان ہو گیا کہ گھر کے بھیدی دشمنوں کے حملوں کی فکر نہ رہی اور اپنی حفاظت و حراست کے سامان مہیا کرلیں، زندگی کے سازوسامان کی

---

[1] میں کسی کے اصحاب کو نہیں جانتا جو میرے اصحاب سے زیادہ بہتر و وفادار ہوں۔

طرف توجہ کریں، کچھ احکام الٰہیہ بہ اطمینان سُن سیکھ سکیں۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ قریش کے لوگ جو کُفّار کے ڈر سے مسلمان نہ ہوتے تھے وہ مسلمان ہونے لگے۔ اب صلح کے سبب باوجود مکہ میں ہونے کے کوئی اُنھیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ علی الاعلان مسلمانوں کی تبلیغ اور اشاعت وتلاوت قرآن ہونے لگی اور دو ہی سال ہوئے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد دو چند سے زیادہ ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ حجاز میں حکومت تو قائم نہ ہوئی مگر اتنا ضرور ہو گیا کہ اللہ کا نام اور محمدؐ کا کلمہ کوئی جُرم نہ رہا۔ ارکان اسلام کی بجا آوری کھلم کھلا ہونے لگی، ایک شخص دوسرے کو ترغیب اسلام دینے میں آزاد ہو گیا۔ ابن خلدون میں ہے زہری روایت کرتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں اور کفار قریش میں نزاع قائم تھی اُس وقت تک کوئی کسی سے مل جل نہ سکتا تھا۔ جب مصالحت ہو گئی اور لڑائی نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے لوگوں کو امن مل گیا، ایک دوسرے سے ملنے لگے، نہ کوئی کسی کے اسلام سے متعرض ہوتا تھا اور نہ اسلام کی کوئی بُرائی کرتا تھا۔ طبری جلد ۳ ص ۸۱ بھی ملاحظہ ہو، یہاں پر ابو بصیر والا واقعہ صلح امام حسنؑ کو اور زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے۔

رسولؐ اور آپ کے اہل بیتؑ دونوں کی خواہش یہی اور صرف یہی تھی کہ جس اصول و فروع کی تعلیم کے لیے رسولؐ کو بھیجا گیا ہے وہ قائم اور رائج ہوں اور لوگ ان کو سمجھیں، مانیں اور ان پر عمل کریں یہی ان کا مشن تھا۔ یہی اُن کی غرض بعثت تھی۔ یہی اُن کا مطمح نظر تھا، یہی اُن کی زندگی کا حاصل تھا، اسی پر ان کا عمل تھا، اسی پر حیات تھی، اسی کے لیے موت تھی اللھم احینی حیاۃ

محمدؐ و آل محمدؐ و امتنی ممات محمدؐ و آل محمدؐ۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اُن کا اقدام[1] و احجام تھا۔ ضرورت اور وقت پڑ جائے تو لڑنے مرنے سے بھی نہ ڈریں اور ضرورت نہ ہو تو کسی کا عبث خون بہنے نہ پائے۔ مقصد تو مشن کی کامیابی ہے۔

صلح حدیبیہ کے مذکورہ بالا فوائد سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اصطلاحی حیثیت سے اسلام کی جگہ ایمان کی لفظ رکھیئے اور گذشتہ ساری عبارت پڑھ جائیے۔ وہ گہری سازش جو رسولؐ کی زندگی ہی میں کی جا چکی تھی اور گاہے بہ گاہے دلوں کا بھید زبانوں پر آجاتا تھا روز بروز مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ سالار بنی ہاشم کی آنکھ بند ہوتے ہی بنی ہاشم اور اولاد ابوطالبؑ کی نظر میں دنیا اندھیر کر دی گئی۔ خواہ کتنی ہی تاویلیں کی جائیں لیکن ایک منصف صاحب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ جو بنی ہاشم چند دن قبل تک تمام مسلمانوں کے سرتاج تھے آج وہ اتنے دبا دیے گئے کہ بقول شبلی صاحب، اُن سے حکومت بزور منوانا چاہا جاتا ہے۔ وہ تمام واقعات جو صحاح احادیث اور تواریخ میں مذکور ہیں شاہد عادل ہیں کہ اہل بیت رسولؐ کو کچل ڈالنے کی کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ آج بھی اُن امور کو بیان کیا جانا، کبھی گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا فائدہ، یا تبرّا بازی مناسب نہیں یا آپس کی نزاعی باتوں کو چھیڑنا بُرا ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے اسباب مہیا نہ کرو وغیرہ وغیرہ جملے کہہ کر روکا جاتا ہے۔ واقعات سے قطع نظر کرو صرف اس امر پر غور کرو کہ بعد رسولؐ امیر المومنینؑ، فاطمہ زہرؑا، حسنؑ، حسینؑ، ام ایمن کی گواہیاں ناقابلِ سماعت

---

[1] پیش قدمی و خاموشی

قرار دی گئیں اور تن تنہا فرد واحد جابر کی گواہی قبول کی گئی۔ ملاحظہ ہو بخاری کتاب الکفالہ اور اس پر عینی کے الفاظ۔

اس طرح اہل بیتؑ کو غیر مسموع الکلمہ بنایا گیا۔ اُن کی حیثیت کو گرایا گیا اُن کی ہر بات قابلِ اعتراض اور ان کے خلاف ہر بات قابلِ قبول بنائی گئی۔ جب رسولؐ کے مرتے ہی یہ عالم ہو گیا تھا تو آپ کی وفات کے بعد تیس سال تک میں کیا کیا گُل نہ کھلائے گئے ہوں گے جس طرح اسلام کو صلح نبی سے سنبھلنے، قوت حاصل کر لینے، اطمینان کی سانس لینے اور پھیلنے کا موقع ملا اور اس طرح قدم جم سکے کہ پھر متزلزل نہ ہو سکے۔ اسی طرح صلح حسنؑ میں بھی ایمان یعنی تعلیم رسول مطابق تفسیر اہل بیت کو بھی وہی بات حاصل ہوئی جو اسلام کو۔ اب امید نہیں کہ کوئی شیعہ اس میں چہ میگوئی کر سکے۔ بس دونوں صلحوں میں جو فرق نمایاں ہوتا ہے وہ یہ کہ کفار مکہ نے کم از کم دو ڈھائی سال تک صلح کا احترام کیا۔ بخلاف حسنؑ کے مخالف کے کہ اُس نے اسی وقت کُھلّم کُھلّا تمام شرائط کو زیر قدم کچلنے کا اعلان کر دیا اور اُسی وقت سے علانیہ بدعہدی پر عمل کرنے لگا۔ لیکن معاویہ کی بدعہدی کا جُرم امام حسنؑ کی دیانت پر نہیں عائد ہو سکتا۔

سرورکائنات کی صلح کے مصالح نہ سمجھنے پر لوگوں کی چہ میگوئیاں، رسولؐ کا کبیدہ خاطر ہونا، اصحاب کا شک، رنجیدگی اور نا خوشی کا ہونا اس پر آنحضرتؐ کا اصحاب کو اپنی نبوت، عصمت، اطاعت خدا، نصرت پروردگار کی طرف متوجہ کرنا، اور آخرکار مصالح صلح کا آشکار ہو جانا کسی اور تائید کا

محتاج نہیں۔ امام حسنؑ کی صلح اگر سرور کائناتؐ کی صلح کو پیش نظر رکھ کر دیکھی جائے تو ذرّہ برابر جائے کلام نہیں۔ کلام کرنے والا اُسی فہرست میں رکھا جائے گا جس میں وہاں کلام کرنے والے رکھے جاتے ہیں۔ کفار سے نبیؐ کا صلح کرنا جب ناجائز نہیں ہے تو معاویہ سے حسنؑ کی صلح کیونکہ قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے۔

امیرالمومنینؑ کی صلح یا واقعہ حکمین

چونکہ یہ حصہ صرف مدعیان تشیع کی تسکین کے لیے لکھا جا رہا ہے اس لیے مزید اطمینان کے لیے امیرالمومنینؑ کی صلح کا حال لکھنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اس طرح ایک دوسری نظیر بھی مل جائے گی اور اُن اسباب وعلل پر بھی کچھ اطلاع ہو جائے گی جنھوں نے امام حسنؑ کو صلح پر مجبور کیا۔ اس صلح کی پیشینگوئی تو رسول خدا ہی نے کر دی تھی۔ چنانچہ صلح معاویہ کے وقت ویسا ہی ہوا۔

اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور اہلبیت رسولؐ کے حقوق کا خیال مسلمانوں کو ہوتا تو تاریخ اسلام کچھ اور رہی ہوتی۔ قرآن و عترت سے تمسک کی تاکید اور پھر امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ کے رہتے ہوئے دینی مسائل کا مرکز امام ابو حنیفہ کو بنایا جانا کس منطق کا کام ہے۔ اسی ایک مثال سے دوسرے احکام وحالات پر غور کرنے کا کافی موقع ہے۔

سرورِ کائناتؐ کی زندگی ہی سے پکے مسلمانوں میں منافقین اس طرح گھس آئے تھے کہ عام نگاہوں میں تمیز مشتبہ ہو گئی تھی مگر قرآن مجید کے آیات

اور سرور کائناتؐ کے احادیث پر نظر رکھنے والوں کے لیے مومنین اور منافقین کا پرکھ لینا کوئی دشوار کام نہ تھا اور نہ آج ہے۔ کنز العمال وغیرہ میں ہے کہ :

۱۔ "ہم لوگ زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منافقین کو اس طرح پہچانتے تھے کہ یا خدا اور رسولؐ کی تکذیب کرتے یا نماز نہ پڑھتے یا علی بن ابی طالبؑ سے دشمنی کرتے۔

(ص ۵۳ منتخب کنز العمال کتاب الفضائل برحاشیہ مسند بن حنبل ج ۵ طبع مصر)

۲۔ "مسلم نے علیؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور صاحبان حیات کو پیدا کیا بے شک نبی امی نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ نہ دوست رکھے گا مجھے مگر مومن، اور نہ دشمنی کرے گا مجھ سے مگر منافق۔ اور ترمذی نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ پہچانتے رہے منافقین کو اس طرح کہ وہ لوگ علیؑ سے دشمنی کرتے تھے۔" (صواعق محرقہ ص ۷۲ حدیث ہشتم فضائل علی علیہ السلام وخصائص نسائی ص ۱۹، مطبع خیریہ مصر)

عام علامات کے علاوہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافقین کے نام بھی بتلا دیے ہیں، چنانچہ حذیفہ بن یمان صحابی کے متعلق مدارج النبوۃ میں ہے کہ :

"تعلیم کردہ بود آنحضرتؐ او را صفات نفاق و دانانیدہ بود ذوات و اشخاص منافقین و اسمائے ایشاں را کہ کدام اند"۔

اور احیاء العلوم میں ہے کہ "کان یسأل (عمر) حذیفة ویقول انت

صاحب سرّ رسول اللہ فی المنافقین فھل تری علی شیئًا من آثار النفاق "۔ (حضرت عمر حذیفہ سے پوچھا کرتے تھے کہ آپ منافقین کے متعلق رسول اللہ کے راز دار ہیں بھلا مجھ میں آثار نفاق میں سے کچھ پاتے ہیں۔؟)

بہر حال آنحضرتؐ کے وقت سے ہی مومنین اور منافقین خلط ملط ہو گئے تھے لیکن سرورِ کائناتؐ بمصالح شرعیہ کھلم کھلا ان پر کفار کا حکم جاری نہ فرماتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی خود بخود ایسے لوگ نمایاں ہو جاتے تھے اور ایمان و نفاق کھل جاتا تھا۔ جنگ احد کے متعلق ابن خلدون کے مترجم حکیم احمد حسین صاحب الہ آبادی جلد سوم کے ص ۱۱۷ کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں:

"ان واقعات کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے صبر و تحمل و ثابت قدمی اور منافقوں کے لیے یہ لڑائی محک کا حکم رکھتی تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ساٹھ آیتیں سورۂ آل عمران کی اس کے حق میں نازل فرمائیں جس کی تفصیل کو ایک جداگانہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک لڑائی کا عنوان بدل جانے کا اور کوئی ظاہری یا واقعی سبب اس کے سوائے نہ تھا جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔"

(صحابہ اور ان کا ایمان)

حکیم صاحب کی رائے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو قرآن مجید کی آیت ذیل جس میں بھاگنے والوں کے متعلق تذکرہ ہے:

"اے ایمان دارو! جب تم سے کفار سے میدان جنگ میں مقابلہ ہو تو (خبردار) ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرنا، اور (یاد رہے کہ) اس شخص کے

سوا جو لڑائی کے واسطے کترائے یا جماعت کے پاس (جاکر) موقع پائے (اور) جو شخص بھی اس دن اُن کفار کی طرف اپنی پیٹھ پھیرے گا وہ یقینی (ہر پھر کے) خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے اور وہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔"

اور مشکوٰۃ شریف میں ہے:

"رسالت مآب نے فرمایا کہ سات چیزوں سے بچتے رہو، جو ہلاک کر دینے والی ہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپ نے جواب دیا شرک[1] باللہ، سحر[2]، ناحق نفس[3] محترم کا قتل، سود[4] خواری، مال[5] یتیم کھانا، جنگ[6] سے بھاگنا، بے گناہ[7] محصنہ مومنہ کو زنا کی تہمت دینا۔" (یہ حدیث متفق علیہ ہے)۔

(مشکوٰۃ باب الکبائر وعلامات النفاق فصل اول مطبع گلزار محمدی لاہور ۱۳۱۲ھ)۔

اس سے اندازہ ہو گیا کہ جنگ سے بھاگنا کیسا جُرم ہے۔ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو کر پھر پانسہ پلٹ گیا۔ بھاگنے والے بھاگے اور جمنے والے ڈٹے رہے، زخمی ہوئے لڑے بھڑے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔

یہ مقام یاد رکھنے کا ہے کہ بقول ابن وردی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر مدینہ سے باہر نکلے تھے۔

(ابن وردی ج ۱ ص ۱۱۸ مطبع وہبیہ مصر ۱۲۸۵ھ)

اور بقول صاحب حبیب السیر: "ابتدا میں جب سپاہِ اسلام بھاگی تھی

تو سوائے مرتضیٰؑ کے مصطفیٰؐ کے ساتھ کوئی نہ رہا۔ ایک ساعت کے بعد عاصم بن ثابت اور ابو دجانہ اور سہل بن حنیف اور طلحہ بن عبیداللہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہونچے۔ بقول بخاری بارہ۱۲ آدمی یا بقول دیگر مورخین زیادہ سے زیادہ چودہ۱۴ آدمی ثابت قدم رہے۔ (دیکھو تاریخ اسلام) غور کا مقام ہے، خود سرور انبیاء کا ساتھ ہے، گھر سے کچھ دور نہیں، کوئی خاص نمایاں شدّت نہیں، پھر بھی ایک ہزار میں سے صرف بارہ یا چودہ مرد میداں نکلے، باقی سب نے پیٹھ دکھادی ۔۔ اور بروایت حیاۃ القلوب، آگے چل کر جنگ تبوک کے موقع پر جو آخری غزوہ تھا جب سب شمار کیا گیا تو غلام اور نوکروں کے علاوہ پچیس ہزار نفری تھے مگر جب صاحبانِ ایمان شمار کیے گئے تو صرف پچیس نکلے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پکّے مسلمانوں میں کچّے کس تناسب سے شامل تھے اور جب خود حضورؐ کے سامنے یہ عالم تھا تو آپ کی آنکھ بند ہونے کے بعد تو علی الخصوص اہلبیتؑ کے لیے عالم ہی دگرگوں ہو گیا تھا۔ جن لوگوں کے بل بوتے پر جنگ کی جاتی ہے وہ کل بیعت کرنے والے اور ساتھ نکلنے والے لشکریوں میں کتنے واقعی اور کتنے دورنگے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ کھرے کھوٹے کی پرکھ قائم کر دینے والی یہ جنگ ہوئی اور جو کچھ ہوا اس سے تواریخ اسلام کے ورق سیاہ ہیں۔ جنگ میں پوری پوری شکست ہوئی۔ خود قرآن پاک واقعات کی سچّی شہادت بہ آواز بلند دے رہا ہے۔ یہ سب ہوا مگر نہ تو رسولِ خدا نے اُن اصحاب کو اپنی جمعیت سے باہر نکالا نہ اُن پر آئندہ کے لیے حکم کفر جاری فرمایا بلکہ خونِ جگر پی کر رہ گئے۔ ایسے مشاہدات کے باوجود جب کبھی آئندہ موقع ہوا سبھی کو دعوتِ جہاد دی،

اور جو ساتھ ہو لیا چاہے اندر سے جیسا بھی رہا ہو ساتھ لے لیا۔ غالباً اب بالکل واضح ہو گیا ہوگا کہ عہد رسالت سے ہی مدعیانِ اسلام میں اہلبیت کے دوست و دشمن، مومن و منافق، کھرے اور کھوٹے، قابلِ وثوق اور ناقابلِ اعتماد مخلوط تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آنکھ بند کرنا تھا کہ آپ کی ذرّیت پر مصیبت کا پہاڑ پھٹ پڑا اور ایسے دردناک مظالم و شدائد کی بارش ہوئی جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ اوّلاً جہالت ثانیاً ناجائز پروپیگنڈے کی شکار دنیا پیتل کو سونا بلکہ راکھ کو کیمیا سمجھنے لگی۔ سازش اور گہری سازش پہلے سے کام کر رہی تھی نتیجہ ظاہر ہے کہ معدن نبوت کے جواہر پاروں کو تاج سر بنانے کے عوض خاکستر قید و حبس میں ڈھانک دیا گیا۔ سرور کائناتؐ کی عترت اور آپ کے کلمہ گویوں کی داستانِ عبرت سے پڑھنے والوں کی روح لرز جاتی ہے اور ایک باحمیّت مسلمان انصاف پسند انسانوں کے سامنے سوائے سر جھکا لینے کے اور کوئی چارہ نہیں پاتا۔ خاتم الانبیاءؐ کا انتقال ہوتا ہے اور آپ کی ذُرّیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ کسی کے گلے میں پھندہ کسی کے جسم اقدس پر دُرّہ، کسی کو زہر ہلاہل اور کسی کو خنجر قاتل، کسی کو قید سلاسل و زنجیر، کسی کو نیزہ و شمشیر۔

ع : غرض بیانِ غمِ اہلبیتؑ آساں نیست

رسولؐ کا جنازہ گھر میں پڑا ہے، اہلبیت رو پیٹ رہے ہیں۔ مگر سقیفہ بنی ساعدہ میں کچھ اور ہی سامان ہو رہا ہے آج اسے جس نام سے پکارا جائے، اس کی جیسی دلفریب تصویر کھینچی جائے مگر اتنا ضرور سمجھا جاتا ہے کہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین کی اہمیت مسلمانوں کے دل میں کتنی تھی اور آپ کی محبت کا تقاضا کیا تھا، اور

اگر سقیفہ کی کارروائی نہایت اہم اور احسن تھی تو عدم شرکت جنازہ پر عمری قلق زی پردہ پوشی ہی کہی جائے گی۔ رسول کے احتضار سے انتقال تک اور انتقال سے تجہیز و تکفین تک کیا ہوا، کیونکر ہوا، اس دردناک داستان کو یہاں دُہرانا مقصود نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ حضرت علیؑ انا احق بھٰذا الامر منکم اور لسریع ما کذبتم علی رسول اللہ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۱۲ و ۱۳ مطبع ادبیہ مصر ۱۳۳۱ھ) کہتے ہی رہے مگر حق کی آواز ہر طرف سے ٹھکرا دی گئی اور اس طرح علی الاعلان رسول کے "فرمان تمسک بہ اہلِ بیت" کی بنیاد اُکھیڑ پھینکی گئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ اصحاب موجود تھے، کتنوں نے یہ آواز اُٹھائی کہ رسولؐ کے بعد تمسک کے لیے قرآن و اہلبیتؑ ہیں نہ کہ قرآن وصحابہ؟ ۔ مسعودی نے لکھا ہے لما بویع ابوبکر یوم السقیفۃ خرج علیؑ فقال افسدت علینا امورنا ولم تستشر ولم ترع لنا حقا فقال ابوبکر بلیٰ ولکن خشیت الفتنۃ یعنی جب یوم سقیفہ ابوبکر کی بیعت کی گئی تو علیؑ نے ابوبکر سے جا کر کہا کہ تم نے ہمارے امور کو تباہ کر دیا، ہم کو پوچھا تک نہیں اور ہمارے حق کی رعایت و نگہداشت مطلقاً نہ کی۔ ابوبکر نے کہا کہ یہ سب صحیح ہے مگر میں فتنہ سے ڈر گیا۔ (مسعودی برحاشیہ نفح الطیب ج ۱، ص ۲۲۱ طبع مصر)۔ خود بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ خیبر ص ۳۶ جلد سوم مطبع میمنہ مصر ۱۳۲۰ھ کی وہ مشہور حدیث جس میں جناب سیدہ علیہا السّلام کا میراث طلب کرنا اور نہ ملنا، اس پر آپ کا رنجیدہ ہونا، پھر مرتے دم تک ابوبکر صاحب سے ترک کلام وغیرہ مذکور ہے۔

اُس کا ایک جز یہ بھی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ کنا نری فی ھذا الامر نصیبا فاستبد علینا فوجدنا فی انفسنا یعنی ہم اس امرِ خلافت میں اپنا ہی حق جانتے تھے لیکن ہمارے خلاف اس استبداد سے کام لیا گیا جس سے ہمارا جگر کباب ہو گیا۔ ازیں قبیل کیا کچھ نہ کہا۔ مگر وہاں تو بقول امام غزالی حکومت و ریاست فانی حاصل کرنے کے لیے خواہش نفسانی غالب آچکی تھی —— ایسی ریاست عظیمہ کا ہاتھ آنا اور تمام دیار و امصار میں خلافت کے جھنڈے کا گڑا جانا علم کے پھریروں کا ہوا میں اڑنا اور ہوا کے ساتھ بیرقوں کا لہرانا دو طرفہ جلوس میں سواروں کی ہمراہی، گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں ملکوں اور شہروں کا فتح ہونا۔ ان سب خیالات نے ان لوگوں کو خواہش نفسانی کا جام پلا کر مدہوش کر دیا تھا اور اسی مخموری میں وہ خلیفہ بن گئے۔ (سرالعالمین مقالہ رابعہ ص ۹ مطبوع بمبئی ۱۳۱۴ھ) جب رسول ہی کی محبت اتنی تھی کہ مصطفےٰ را بے کفن بگذاشتند تو اس جماعت سے علیؑ کی ہمنوائی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے لکھا ہے:

"امیر المومنینؑ کا قول لیس لی معین الخ یہ تو ایسی بات ہے جسے آپ ہمیشہ ہی کہا کرتے تھے اور یہ موقع آپ کے، بعد وفات رسولؐ فرمانے کا ہے۔ آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش مجھے چالیس ارادے کے پکے مل جاتے (تو میں مخالفین کو مزہ چکھا دیتا) اس کو نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں اور بھی بہت سے صاحبانِ سیرت نے نقل کیا ہے۔" (دیکھو ابطال الباطل جلد ۱ ص ۱۲۲، ذیل خطبہ فنظرت فاذا لیس لی معین الا اھلبیتی الخ)

جو لوگ واقعہ سقیفہ کے جواز کی توجیہیں کرنا چاہتے ہیں وہ جناب امیرؑ کے ہوا خواہوں کی تعداد بڑھانے میں بڑے انہماک سے کام لیتے ہیں۔ لیکن زبانی جمع خرچ اور چیز ہے اور واقعیت اور چیز ہے۔ کلمہ پڑھ لینے والے کو مسلمان ضرور کہا جاتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری جانبازی اور حقیقی سرفروشی کے مظاہرہ میں بھی ایسوں پر بھروسہ کیا جائے۔ اُحد کا ذکر ابھی اس کا شاہد عادل گزرا۔ اسی طرح امیرالمومنینؑ کی حقیقت کا اگرچہ ظاہری اقرار بھی ہو مگر واقعی تن، من، دھن سے علیؑ کا ہو جانا جن کے بھروسہ پر کسی جنگی کارروائی کا خیال ہو سکے ایسوں کی تعداد بقول خود حضرت کے چالیس تک بھی نہ پہونچتی تھی بلکہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے امیرالمومنینؑ کو ایسے چالیس تو کیا پانچ بھی نہ ملتے تھے، جس کی تصریح علامہ ابن ابی الحدید نے اس طرح کی ہے:

"اور بیان کیا گیا ہے کہ جو کچھ بروز سقیفہ ہوا۔ اس کے بعد جب حضرت علیؑ نے مسلمانوں سے اپنی مدد چاہی جس کی صورت یہ ہوئی کہ رات کے وقت جناب سیدہؑ کو دراز گوش پر سوار کر کے حسنینؑ کو آگے لیے ہوئے آپ انصار اور دوسرے لوگوں کے مکانوں پر جاتے اور ان سے مدد و معونت چاہتے اس پر رات کو تو چالیس شخصوں نے وعدہ کیا اور مرجانے کی بیعت کی۔ آپ نے کہا کہ سویرے سر منڈا کر آجانا اور سلاح ہمراہ لانا۔ جب صبح ہوئی تو سوائے صرف چار کے کوئی بھی نہ آیا۔"

(ملاحظہ ہو ابن ابی الحدید جلد ۳، ص ۵ ذیل لنا هضت القوم)

اسی طرح پے در پے تین راتیں گزریں، رات کو وعدے ہوتے اور صبح کو وہی چار

کے چار۔ اور بروایت رجال کشی مہاجرین و انصار خلافت آپ کا حق ہونے کا اقرار کرتے، ساتھ ہو کر جان دینے کا وعدہ کرتے مگر صبح کو صرف تین بزرگ دکھائی دیتے۔ صاحبانِ انصاف غور کریں کہ دل و جان سے اہلبیتؑ پر قربان ہونے والوں کی تعداد کیا تھی (اس موقع پر واقعہ بیعت رضواں پیش نظر رکھنا چاہیئے، کتنوں نے بیعت کی تھی اور رسولؐ پر واقعی اعتماد کتنوں کو تھا) آگے بڑھ کر یہ بھی نہ رہا۔ اگرچہ حکومت ظاہری مل چکی تھی وہ تمام لوگ جو خلیفۂ ثالث تک کے زمانہ میں خلفاء کی رعایا میں شمار ہوتے تھے یہاں بھی ایسا ہی سمجھا جا رہا تھا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ آپ کی بیعت بھی کر لی تھی مگر حال یہ تھا کہ:

"حضرت علی سے مروی ہے کہ آپ منبر کوفہ پر باغیوں سے جہاد کے لیے لوگوں کو دعوت دیتے تھے تو کسی نے جواب نہ دیا صرف دو آدمیوں نے وعدہ کیا۔ آپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر اُن کے لیے دعا کی اور فرمایا کہ جو میرا ارادہ ہے اس میں تم دو سے کیا کام چل سکتا ہے۔"

(کشاف ج ۱، ص ۲۰۹ طبع بولاق مائدہ ع ۴)

مذکورہ بالا واقعات سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ اہلبیتؑ رسولؐ کی قدر اور ان کے حقوق کا احترام بلکہ رسولِ خداؐ کا احترام ان مسلمانوں کے دل میں کیا تھا اور ظاہر کیا کرتے تھے۔ کیا اسی بے پروبالی کے عالم میں جنگ مناسب ہوتی ہے خصوصاً جب یہ بھی ملحوظ رہے کہ علیؑ کے ساتھ تو یہ برتاؤ اور دوسری طرف یہ رنگ کہ مالک ابن نویرہ غریب کو بالکل بے گناہ قتل کیا جائے، اس کی بیوی سے اُسی روز زنا کی جائے اور کوئی پُرسانِ حال نہ ہو (تاریخ اسلام)، بلکہ خالد صاحب

اُنکے لئے سیف اللہ کا خطاب پائیں۔ سعد بن عبادہ کی جان شام تک میں جا چھپنے کے باوجود نہ بچے۔ حضرت عمر وہاں آدمی بھیج کر مروا ڈالیں[۱] وغیرہ۔

غرض یہ سلسلہ ہر روز دراز تر ہوتا گیا اور حضرت علیؑ موقع موقع سے جہاں تک دین کی حفاظت ممکن تھی کرتے رہے اور اپنے حقوق جتاتے رہے۔ چنانچہ جب حضرت عثمان کی خلافت مانی گئی اس وقت پھر آپ نے کھلم کھلا یہ اپنا حق ظاہر فرمایا:

"کچھ آج پہلا دن تو نہیں کہ تم لوگوں نے ہم پر تغلب کر لیا۔ اب صبر جمیل ہے اور جیسا تم کہتے ہو اس کے برخلاف ہم اللہ ہی سے مدد چاہیں گے۔"

(دیکھو ابوالفدا ج ۱ ص ۱۶۶ طبع مصر)

مختصر یہ کہ اہل بیتؑ کے خلاف مسلسل سازشوں کا سلسلہ منقطع یا کمزور ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا اور مستحکم ہوتا رہا" لیکن اہلبیتؑ نے جن کو دین خدا سب سے زیادہ عزیز تھا ایک طرف تو ان شدائد و مصائب پر صبر کیا جو مخالفین کی طرف سے ہوتے رہے دوسری طرف آہستہ آہستہ اپنے حقوق کا اثبات اپنے معجزات، اخبار بالغیب، مافوق العادۃ تحمل مظالم، بر دلیل نشر آیات و احادیث، خلق حسن، غرض اتنے مکمل علمی و عملی کام نمونۂ رسولؐ ہونے کے ذریعہ کرتے رہے اور دنیا اس مطمح نظر اور مقصد اصلی کی تلقین اور تبلیغ کرتے رہے جو رسولؐ کی غرض بعثت تھی اور جو چھپکے سے مر جانے اور فنا ہو جانے سے ہرگز پوری نہ ہو سکتی اور بے محل

---

[۱] دیکھو عقد فرید جلد ۲ ص ۲۵۳ مطبوع قاہرہ ۱۳۰۲ھ

جنگ نہ کر کے مظلوم رہ کے اپنے مخالفوں کو ظالم اور قولاً و فعلاً تعلیم رسولؐ کا مخالف ثابت کر کے صاحبانِ بصیرت انصاف کی نظر میں شکست فاش دیتے رہے۔

جب دُنیا نے تعلیمات رسولؐ اور واقعات کو اس طرح چھپایا مٹایا اور پسِ پُشت ڈال دیا تھا کہ علی الاعلان حضرت علیؑ کے برادر رسول ہونے سے انکار کیا جاتا ہے (کتاب الامامۃ والسیاسۃ) اور کسی مدعی اسلام کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ آیات قرآنیہ کو من مانی باتوں سے رد کیا جاتا ہے اور باوجود فاطمہؑ و علیؑ و حسنؑ و حسینؑ و ام ایمن کے اتفاق و شہادت کے میراث انبیاء سے انکار کیا جاتا ہے اور جب دل چاہتا ہے کسی کو کچھ دے کر اس کا نام تبرک رکھا جاتا ہے اور کسی مدعی اسلام کے منھ میں زبان نہیں ہوتی جو ٹوکے۔ آیت قرآن کو بلا کسی آیت کے منسوخ فرمایا جاتا ہے اور کسی کا چوں و چرا کرنا کیسا آمنّا و صدّقنا کر لیا جاتا ہے۔ نافلہ نماز میں جماعت کے حرام ہونے کے باوجود اس کی ایجاد ہوتی ہے اور اس کو بدعت حسنہ کہہ کر قابلِ تسلیم فرض کیا جاتا ہے۔ رسولؐ کے وقت کی اذان میں ترمیم ہوتی ہے اور کوئی کچھ نہیں بولتا یا بول سکتا وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات میں اگر امیرالمومنینؑ جنگ کر کے مر جاتے یا سعد بن عبادہ کا سا جوش ظاہر کرتے آپ کے واسطے بھی قاتل جن تیار کر دیا جاتا۔ تو نہ علیؑ رہتے نہ حسنؑ نہ حسینؑ ہوتے نہ باقی ائمہ، اور اس طرح آج تعلیم رسول دنیا سے یک قلم خالی ہو جاتی۔ وہ تمام علوم شریعت زیر خاک ہو جاتے جو مصائب برداشت کر کے تیسؔ سال میں امیرالمومنینؑ نے دنیا تک پہونچائے اور جن کا باغ مخلصین کے سینوں میں لگا گئے اور جو رفتہ رفتہ سرسبز ہوتا گیا جس کی باغبانی علیؑ کی گیارہؔ پُشت تک مسلسل ہوتی رہی اور وہ اہلبیتؑ جن کا نام و نشان مٹانے

کی قسم کھائی گئی تھی آج ان کی نسل اور ان کے ارشادات سے مشرق و مغرب عالم فیضیاب ہو رہا ہے۔ (واقعہ کو مثال سے سمجھئے)

ناظرین کے اذہان میں مزید استحکام کے لیے اس موقع پر ایک مثال لکھی جاتی ہے اور انصاف طلب ہوں کہ آیا علیؑ کی زندگی اور زندہ رہ کر دینِ خدا کی حفاظت کے مواقع نکالنا اور وقت پر نہ چوکنا دین اسلام کی بجت اور ترویج حق وحقیقت اس کی بقا و استحکام کا سبب تھی' یا بے یار و انصار صرف ان چند با اخلاص اہل بیتؑ و انصار کو لے کر میدانِ جنگ میں آنا، لڑ کر جان دے دینا اور اپنی قبر میں اپنے ساتھ اُن حقائق کو دفن ہو جانے دینا جو سلہ سے لے کر سنہ تک مختلف عنوان سے ظاہر ہوتے رہے اور اتنی دور تک پھیل گئے کہ بعد کا یلغار ان سب کو دبا یا فنا نہ کر سکا۔

مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتوں نے حضرت عمر کے دربار میں ایک ہی لڑکے کے بارے میں دعویٰ کیا۔ ہر ایک کہتی تھی کہ لڑکا اس کا ہے' اور نہ کوئی تیسرا مدعی تھا نہ ان دونوں کے پاس کوئی گواہ تھا۔ حضرت عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فیصلہ کریں۔ آخر حضرت علیؑ کی طرف رجوع کی۔ آپ نے ان دونوں کو بلوا کر پہلے تو بہت سمجھایا بجھایا، ڈرایا دھمکایا مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔ آخر جب اُن کا جھگڑا ختم نہ ہوا تو آپ نے آرہ منگوایا۔ اب تو دونوں عورتیں بول اٹھیں کہ کیا کیجیے گا؟ — آپ نے فرمایا کہ نہ مانو گی تو پھر اس لڑکے کو دو آدھے کر کے آدھا آدھا دونوں کو بانٹ دوں گا۔ یہ سُن کر ایک تو چپ ہو گئی، مگر دوسری چیخنے لگی کہ خدا کا واسطہ اے ابو الحسنؑ! اگر یہی ہونا ہے تو میں اِس

بچّے کو اس عورت کو دیے دیتی ہوں۔ یہ سُننا تھا کہ آپ نے آوازِ تکبیر بلند کی، اور فرمایا کہ بس لڑکا تیرا ہی ہے اس کا نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا ہوتا تو (کٹتے دیکھ کر) اس کا دل ضرور تڑپ جاتا۔ اب دوسری عورت نے بھی مانا کہ بیشک لڑکا پہلی ہی کا ہے، اُس (دوسری) کا نہیں ہے، پہلی ہی سچ کہتی تھی۔ یوں حضرت عمرؓ کی مشکل بھی حل ہوئی، بلکہ اپنی اس مشکل کشائی پر حضرت عمرؓ نے امیرالمومنینؑ کو دعائیں بھی دیں۔

دیکھئے بمقتضائے فطرت جو ماں نہ تھی اُسے پرواہ بھی نہ ہوئی کہ لڑکا رہتا ہے یا مرتا ہے، مگر جو حقیقتاً ماں تھی بچّے کے چیرے جانے کے خیال ہی سے تڑپ گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بچّہ دو ٹکڑے ہو جاتا تو جھوٹی دعوے دار کو بھی کچھ نہ ملتا مگر اس کا کچھ کھو بھی نہ جاتا۔ لیکن اس سے اس پر کیا اثر پڑتا تھا بخلاف اس کے واقعی ماں کو اضطراب ہوا اور اس پر راضی ہو گئی کہ اس کی گود خالی ہی سہی، اور دوں پر نا گوار ہی سہی بچّہ تو سلامت رہے۔ دوسری ہی گود میں رہ کر زندہ تو رہ جائے چاہے اُس کی تربیت ماں کی سی نہ بھی ہو۔ جب بڑا ہو گا، عقل و ہوش سنبھالے گا تو اُسے اور اہلِ عالم کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس کا فرزند ہے اور اس کی ماں کون ہے اور ڈائن کون۔

یوں ہی اہلبیتؑ کو خیال کیجئے جب وہ یہ دیکھتے کہ اسلام کا عین واثر سب گم ہوا چاہتا ہے تو اتنے پر صبر و شکر کر لیتے کہ کم از کم نام تو زندہ رہے۔ ہم آہستہ آہستہ اس کی روح بھی دنیا کے سامنے پیش کر لیں گے۔ ابھی زبان سے کُھلّم کُھلّا انکار نہیں ہے لا الٰہ الا اللہ اور محمّد رسول اللہ کا

زبانی اقرار ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی ایسا بھی ہو جائے گا جس کے دل میں بھی اُتر ہی جائے گا۔ دیکھو خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں مولفۃ القلوب تھے مگر باوجود باطنی کفر کے زکوٰۃ میں سے ان کا بھی ایک حصہ جس کا فائدہ یہ تھا کہ کم از کم ان کے اور ان کے ہم مشربوں کے شر سے محفوظ قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولٰکن قولوا اسلمنا ولما ید الایمان فی قلوبکم۔ اس سے واضح ہے کہ اعراب کے دل میں با و ایمان نہ ہونے کے صرف زبانی اقرار سے ظاہری اسلام کا حکم ان کے جاری تھا، اسی طرح تباسی رسولؐ آل رسولؑ بھی مصانعہ اور مدارات سے کام شدتیں جھیلتے اور دین کو اپنی ملکیت جان کر فنا کے جھونکوں سے محفوظ رکھتے اور جو لوگ دین کے نام پر دنیا حاصل کرتے چونکہ ان کا مطلوب دنیا ہوتی تک استحصال دنیا میں اظہار دین مبین ہوتا اظہار دین کرتے اور جہاں پر دین کی پابندی سے دنیا چھوٹتی نظر آتی وہاں دین کو سراسر پس پشت ڈال دیتے۔

واقعات کی اجمالی تصویر کشی میں بھی اتنا طول ہو گیا، لیکن غالباً اب صاحب فہم کو اس میں شک نہ باقی رہا ہوگا کہ رسولؐ کے بعد اہلبیتؑ رسولؐ کے ساتھ دنیا کا کیا رنگ تھا۔ پھر امام حسنؑ تک آتے آتے کیا حالات ہو چکے ہوں اور آپ کو کس درجہ مجبوری رہی ہوگی، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی صورت نہ لڑ جانا ہی مفید تھا۔ کیونکہ ناصر و معین ندارد، نہ ایک دم بے تعلقی ممکن تھی پھر اصلی تعلیم رسول و حقوق اہلبیتؑ کی طرف سے بالکل ہی غفلت ہو جاتی بہر حال ابھی ہم دوسرے واقعات سے بحث نہیں کرنا چاہتے ابھی تو یہ دکھلا

ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کو بھی مجبوری ہوئی تھی کہ صلح کرتے، وہ کیا تھی اور کیوں تھی تاکہ اسی پر امام حسنؑ کی صلح کا قیاس نتیجہ خیز ہو جائے۔

اضافت کی غلطی عقیدہ کی صورت:

ابوبکر صاحب ڈھائی سال اور چند ماہ کی مختصر سی حکومت کر گئے۔ مگر ایسی جڑ قائم ہو گئی کہ خلافت نبویہ نے حکومت دنیویہ کی پوری پوری حیثیت اختیار کر لی، اور جو شخص اس موقع پر غلطی کا شکار ہو گیا اس کو اس پھندے سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ سرور کائنات کے بعد جتنی حکومتیں ہوئیں سوائے ایک کے ہرگز ان کو اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا ہاں وہ مسلمانوں کی حکومتیں کہلا سکتی ہیں۔ اس لیے کہ اسلامی تو جب ہوں کہ قوانین اسلامیہ قرآنیہ اور سنن نبویہ دستور العمل ہوں بھلا رسول اللہ کی حکومت اور قیصر و کسریٰ کا معیار یہ تو اسلام کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ اگر بعد رسولؐ حضرت ابوبکر کو خلیفۂ رسولؐ نہ کہا جائے اور صرف مسلمان بادشاہ کہا جائے تو یقیناً شیعہ، سُنّی نزاع بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ مگر مصیبت کا دروازہ تو اُسے الٰہی کہہ کر کھولا جاتا ہے بلکہ اس دن سے آج تک کی تمام خانہ جنگیوں کی بنا اس خلافت کو دینی حکومت اور حکومت الٰہیّہ کہنا ہے۔ اگر اہل سنت اپنی کتاب کی اس روایت کو غور سے پڑھیں تو شاید مشکل دور ہو جائے۔ لما قبض النبیؐ نظرنا فی امرنا فوجدنا النبیؐ قد قدم ابابکر فی الصلوٰۃ فرضینا لدنیانا ما رضیۃ النبی لدیننا۔ یعنی جب آنحضرتؐ کا انتقال ہوا اور ہم لوگوں نے اپنے بارے میں غور کیا تو یہ دیکھا کہ نبیؐ نے ابوبکر کو نماز میں آگے

کیا ہے، تو اب ہم لوگوں نے "اپنی دنیا" کے واسطے اس کو پسند کیا جس کو نبیؐ نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا تھا۔

کیوں نہ اس روایت کی روشنی میں حضرت ابوبکر کی حکومت کو دنیا کی حکومت مان لیا جائے۔ جانے کو تو یہ حکومت جلد ہی چلی گئی لیکن ممالک مفتوحہ و مقبوضہ پر کیا اثر چھوڑ گئی اس کا اندازہ لگانے کے لیے ایک نظر بعض بعض حکّام اور علاقہ پر بھی ڈالنا ضروری ہے اور خصوصیت سے شام کے حالات مزید احتیاط سے دیکھے جانے کے لائق ہیں۔ خلافت اولیٰ میں خالد بن ولید حاکم شام تھا اور حضرت عمر کے وقت بقول طبری کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ، بصرہ میں ابوموسیٰ اشعری، مصر میں عمرو بن العاص اور بقول ابن خلدون شام میں ابوعبیدہ (عشرہ مبشرہ کی فہرست پر نظر ڈالو) اور معاویہ اور اس کا بھائی یزید بن سُفیان، کوفہ میں سعد بن ابی وقاص، طائف میں عثمان بن العاص حضرت ابوبکر ہی کے وقت سے عامل تھے، حمص کا حاکم خلافت ثانیہ میں عمر بن سعد تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان مقامات میں اور ان عمال کے زیر اثر اہلبیتؑ کے حقوق کا کیا حال کر دیا ہوگا۔ یہ تو تھا ہی، اس کے بعد عثمان صاحب کا زمانہ آیا تو ایسا اندھا دھند کارخانہ اُمیہ شاہی چلا کہ دشمن دوست سب ہی چلّا اُٹھے، آپ کے زمانہ کے بعض عمّال کا نام بھی ملحوظ رہے تو حالات کے سمجھنے میں اور آسانی ہوگی۔ بصرہ میں عبداللہ بن عامر، شام میں معاویہ ابن ابی سُفیان اور پھر معاویہ کی طرف سے حمص میں عبدالرحمٰن بن خالد، اردن میں ابوالاعور سلمی، کوفہ میں ابوموسیٰ، آذربائیجان میں اشعث بن قیس کندی، مصر میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔

(معاویہ کی طرف سے ان حکام کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے متعلق دربارِ خلافت سے معاویہ کو حاکم معین کرنے کا اختیار سپرد تھا) یہ تو ابتدائی دَور تھا، آتے آتے آخری زمانہ ایسا آیا کہ پیمانہ چھلک گیا۔ مثل مشہور ہے "تنگ آمد بہ جنگ آمد" لوگوں نے دھاوا بول دیا اور خود اصحاب و تابعین کے گروہ نے حضرت عثمان ہی کا خاتمہ کر دیا۔ چوبیس پچیس سال میں اہلبیتؑ کے خلاف کیا رنگ کھیلا گیا ہوگا۔ اتنے مختصر لفظوں میں ہرگز ادا نہیں ہو سکتا، جس حکومت کی مشین میں ایسے پُرزے لگے ہوں جن کے متعلق شبلی صاحب (اپنا مطمح نظر ملحوظ رکھتے ہوئے) یہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ عموماً مسلّم ہے کہ جوہر شناسی کی صفت ان میں (حضرت عمر میں) سب سے بڑھ کر تھی۔ اس ذریعہ سے انھوں نے تمام عرب میں قابل آدمیوں اور ان کی مختلف قابلیتوں سے واقفیت پیدا کی تھی اور انہی قابلیتوں کے لحاظ سے اُن کو مناسب عہدے دئیے تھے۔ سیاست و انتظام کے فن میں عرب میں چار شخص اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن سمیہ۔ چنانچہ ان سب کو بڑی بڑی ملکی خدمتیں سپرد کیں اور در حقیقت ان لوگوں کے سوا شام و مصر و کوفہ پر اور کوئی شخص قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔" (الفاروق ج ۲، ص ۱۵۳، قومی پریس دہلی ۱۹۰۸ء)

شبلی صاحب نے دھاۃ کا ترجمہ "سیاست و انتظام کا فن" کیا ہے۔ ترجمہ صحیح ہو یا غلط، قابلِ دریافت صرف یہ ہے کہ ساری "جوہر شناسی" اور "قابلیت"

کے باوجود یہ تو ارشاد ہو کہ ان قابل ہستیوں میں جوہر شناس صاحب نے "دین محمدیؐ" کا جزو کتنا پایا تھا، اور تو اور خود جوہر شناس صاحب نے امیر معاویہ کے لیے کیا فرمایا تھا، امام نسائیؒ و شافعی کے اقوال کیا ہیں۔ اس وقت مجھے ان تمام باتوں کی طرف توجہ دلانا نہیں ہے صرف یہ دکھلانا ہے کہ ایسے ایسے "قابل آدمیوں" کی حکومتوں میں اہلبیتؑ کا کیا حال ہوگا۔ ناظرین ان عمّال کے اعمال کو احادیث واخبار کی روشنی میں ایک دیانت دار مسلمان کی آنکھ سے ملاحظہ فرمائیں۔

شبلی صاحب نے تو یہ تصریح کردی ہے کہ "یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؑ سے بھی بزور منوانا چاہا گو بنو ہاشم نے آسانی سے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی" (الفاروق ج ۱ ص ۵۲) جس سے واضح ہوگیا کہ یہ حکومت کس رنگ سے شروع ہوتی ہے اور اہلبیتؑ ابتدا ہی میں اس درجہ کمزور کر دیے گئے کہ ان سے حکومت بزور منوانے کی خواہش ہوئی اور بقول آپ کے مانی بھی گئی تو باسانی نہیں۔ تو آگے چل کر اس حکومت نے کیا گل کھلائے ہوں گے۔ نہ صرف اتنا بلکہ بنی ہاشم عہدوں سے محروم رکھے گئے۔[1] (الفاروق ج ۲ ص ۱۵۷) اور جناب شبلی آج بھی اس کی تاویلیں کرتے نظر آتے ہیں بلکہ ج ۱ ص ۵۷ الفاروق پر اس حد تک آگئے ہیں کہ بنی ہاشم کی مخالفت کو "سازش" کی لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "بنو ہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اسی وقت جماعت اسلام

---

[1] شبلی صاحب کہتے ہیں کہ "بنو ہاشم کو بھی ملکی عہدے نہیں دیے اور اس میں زیادہ تر یہی مصلحت ملحوظ تھی"۔ (الفاروق ج ۲، ص ۱۵۲)

کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہوتیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السّلام اور امیر معاویہ میں واقع ہوئیں"۔ افسوس اور تعجب تو اس پر ہے کہ جس خانہ جنگی کو معیوب اور خطرناک قرار دے کر نظیر پیش کی گئی ہے اُس کے بانی وہی جوہر شناس" ٹھہرتے ہیں جنھوں نے ایسے "قابل آدمی" کو حاکم شام بنایا اور لطیفہ یہ کہ باوجود اس بُرائی کے جس کے ڈر سے بنی ہاشم کو سازشی کا خطاب دیا گیا۔ آج بھی وہ امیر معاویہ واجب الاحترام قرار دیے جا رہے ہیں۔

یہ تو عمّال کی حالت اس طرح اہلبیتؑ اور ان کا خاندان کچلا گیا اور پھر اکملت لکم دینکم اور من لم یحکم بما انزل اللہ ان احکم بما اراک اللہ وغیرہ آیات کے حکومت میں قدیم سلطنتوں[1] کے قواعد سُننا اور ان کو اسلام میں داخل کر کے سلطنت مخلوطہ کا رواج آلِ رسولؐ کی حکومت اور ان کی حرف بہ حرف پیروی رسولؐ اور حق و دیانت پرسختی سے جمے رہنے کی عادت کے حق میں کیسا درخت لگایا گیا وہ صاحبان بصیرت پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

---

[1] الفاروق ج ۲ ص ۱۵۴۔ "حضرت عمر کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ وہ قدیم سلطنتوں کے اور حکمرانوں کے قواعد اور انتظامات سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور ان میں جو چیزیں پسند کے قابل ہوتی تھیں اس کو اختیار کرتے تھے۔ خراج، عشور، دفتر رسد کاغذات حساب ان تمام انتظامات میں انھوں نے ایران اور شام کے قدیم قواعد پر عمل کیا۔

حضرت عثمان کا مارا جانا اور مسلمانوں کا اس وقت کا حال تاریخ داں حضرات سے مخفی نہیں۔ حضرت علیؑ کی بیعت کی گئی۔ کیوں اور کس طرح یہ داستان طویل ہے بہر حال بیعت کی گئی۔ آپ نے ہر چند لوگوں کو ٹالا آپ کو وصیت رسولؐ اور پچیس سال کے تجربات ظاہر بینوں کی اصطلاح کی بنا پر علاوہ خصوصی اور چشم دید حالات یہ بتا رہے تھے کہ ان لوگوں سے وفا کی کوئی امید نہیں۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی ذاتی مطمح نظر ہے اگر وہ پورا نہ کیا گیا تو وہ ساتھ نہ دے گا۔

ادھر آپ اپنے علم و یقین کتاب خدا و سنتِ رسولؐ سے سر مو تجاوز کرنے والے نہ تھے اسی خیال پر ثابت قدم تھے اور اسی کا ارادہ تھا، کسی کی ناحق خواہش کو پورا کرنے والے نہ تھے، آپ کو دھوکا، فریب، عیّاری، مکّاری سے حکومت دنیاوی قائم کرنا نہ تھی۔ جس علیؑ نے باوجود اپنی حقیقت پر مکمّل اعتماد کے بیعتِ شوریٰ میں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ سے ہٹنا گوارا نہ کیا، سیرتِ شیخین کی پیروی کا زبانی وعدہ پسند نہ کیا اور سلطنت پر لات مار دی، وہ اب جب خود لوگ آ رہے تھے کتابِ خدا اور سُنّتِ رسولؐ سے سر مو تجاوز کا خیال دل میں کیوں کر لا سکتا تھا۔ انتقال رسولؐ کے وقت پچیس سال تک جن لوگوں کو آزادی کی مشق ہو چکی تھی ان پر کیا اعتماد ہو سکتا تھا چنانچہ آپ نے اس کو خوب خوب واضح کر دیا، لیکن اس وقت کی خلقت کچھ ایسی پھنس گئی تھی کہ علیؑ کے سوا اور کہیں پناہ کی جگہ ہی نہ تھی۔

طبری جلد ۵ ص ۱۵۶ کی عبارت ذیل اس موقع پر قابل ملاحظہ ہے:

"محمد و طلحہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے کہا کہ اے اہلِ مدینہ! جو تم پر لازم ہے اُسے اختیار کرو، ہم لوگ تمھیں دو دن کی مہلت دیتے ہیں۔ اب اگر

تم (اپنے فریضہ سے) فارغ البالی نہ حاصل کر سکے تو پھر ہم لوگ علیؑ، طلحہ، زبیر اور بہت سے آدمیوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اب لوگ علیؑ پر ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑے اور یہ کہنے لگے کہ ہم لوگ آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام پر کیا بلا آ پڑی ہے اور ذوی القربیٰ کے باب میں ہمارا کیسا ابتلا ہوا ہے۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ میرا پیچھا چھوڑ دو کسی اور کو تلاش کرو۔ معاملہ یہ ہے کہ جو امور ہمارے سامنے ہیں اس میں کتنی باتیں اور کتنے رنگ ہیں جنھیں قلب برداشت نہ کر سکیں گے اور ان پر عقلیں جمنا گوارہ نہ کریں گی۔ اس پر ان لوگوں نے آپ کو خدا کی قسمیں دلانا شروع کر دیں اور کہنے لگے کہ کیا جو حالت میں ہم لوگ دیکھ رہے ہیں، کیا جو فتنہ برپا ہے اس سے آپ واقف نہیں ہیں، بھلا آپ خدا کا خوف بھی نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جو جواب دیا ہے وہ اس بنا پر ہے جسے میں دیکھ رہا ہوں (لیکن) خوب سمجھ لو کہ اگر میں تمھاری بات مانوں گا (بیعت پر راضی ہوں گا) تو تم کو ہمارے علم کے مطابق چلنا پڑے گا (لہذا اگر تم مجھے چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسا ایک میں بھی ہوں گا (ہمارے علم کے مطابق چلنے چلانے کا کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔"

مختصر یہ کہ ان حالات میں بیعت ہوئی اور ادھر بیعت[1] کا پورا ہونا تھا اور

---

[1] مبین نے وسیلۃ النجاۃ ص ۱۰۲ میں لکھا ہے کہ باوجود آنکہ در حضرت علی علیہ السلام رسوخ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ادھر رنگ ہی دگرگوں ہوگیا۔ وہی لوگ جو حضرت عثمان کے قتل و کفر کے فتوے کر رہے تھے، عثمان کو مظلوم مقتول کہہ کے آمادۂ پیکار ہوگئے۔ لطیفہ تو یہ کہ قا کوئی کچھ نہیں کہتا۔ حضرت علیؑ سے خون عثمان کی طلب ہے۔ ہر چند علیؑ نے صا فرما دیا کہ نہ میں نے حکم قتل دیا نہ منع کیا۔ مگر دل تو کسی اور دھن میں تھے، بہا نکال کر ناکثین نے بیعت توڑی اور جنگ کی ٹھان کر علیؑ پر چڑھائی کر دی۔ ا مزید طرہ یہ ہوا کہ علی مرتضیٰؑ نے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا و کہ عثمان کے گورنروں کو حکم معزولی دے دیا لوگوں نے عموماً اور ابن عباس خصوصاً سمجھایا کہ یہ امر خلاف مصلحت ہے، طلحہ و زبیر کا کوئی اعتبار نہیں اور خا معاویہ جو طالب جاہ و حکومت ہے اپنی معزولی کا علم پا کر آپ کا دشمن ہو جا۔ اور یہ لوگ اہل شام اور اہل عراق کے اعتقاد کو بگاڑ کے آپ کو قتل عثمان متہم کریں گے ذرا اپنی خلافت کو جم جانے دیجئے بعد میں اس طرح نکال پھینکا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

قدم در سوابق اسلامیہ و وفور اوصاف خلافت خاصہ بود اما انعقاد و بیعت و وجوب انقیاد فی حکم اللہ بہ نسبت او متمکن نہ شد ہر چند مساعی جمیلہ و مشقت ہائے جلیلہ بکار برد لیکن در خلا در اقطار ارض حکم او نافذ گشت و تمامی مسلمین تحت حکم او سر نیاوردند و افتراق کلمہ مسلمی پیوست و ائتلاف ایشاں رخت بعدم کشید و مردم بحروب عظیمہ بدو پیش آمدند و دست ا ملک کوتاہ ساختند و روز دائرۂ سلطنت سیما بعد التحکیم منکر شدن گرفت تا آنکہ در آخر بجز کو آں برائے ایشاں صافی نماند۔

جس طرح خمیر میں سے بال کو نکال پھینکتے ہیں۔ علی مرتضیٰؑ نے جواب دیا:

"مصلحت دنیوی تو وہی ہے جو تم کہتے ہو مگر میری نظر عقلی مصلحت دین ہے۔"

اور رعایت دنیا اگر بغیر رعایت دین کے کی جائے تو نہ دین رہتا ہے نہ دنیا:

دنیا مطلب تا ہمہ دینت باشد
دنیا طلبی نہ آں نہ اینت باشد

اور ان گورنروں کی بے اعتدالیوں پر نظر کر کے فرمایا کہ ان گورنروں کی ناہنجاریاں حد درجہ کو پہونچ گئی ہیں، میں اُمّتِ رسولؐ پر بُرے لوگوں کو حکمراں نہیں رکھ سکتا۔ بندگانِ خدا کو ان تکلیفوں سے فوراً نجات دلانی چاہیئے۔ (روضۃ الاحباب حبیب السیر طبری)

مغیرہ کا وہ مشورہ جو قتل عثمان اور بیعت امیر المومنینؑ کے بعد پیش کیا گیا تھا جس کو استیعاب ج ۱ ص ۲۵۹ پر نقل کیا گیا ہے قابل دید ہے اور اس میں معاویہ کے لیے خصوصیت سے امیر المومنینؑ کے یہ الفاظ فلا واللہ لا ارانی اللہ مستعملا لہ ولا مستعینا ما دام علی حالہ (قسم بخدا خدا کبھی نہ دیکھے گا کہ میں معاویہ کو عامل بناؤں یا اس سے مدد لوں جب تک وہ اپنے حال پر رہے گا) اور ان اقررت معٰویۃ علیٰ ما فی یدہ کنت متخذ المضلین عضدا (جو کچھ معاویہ کے قبضہ میں ہے اگر میں اسی پر اسے باقی رہنے دوں تو میں آیت متخذ المضلین عضدا کا مصداق ہو جاؤں گا۔)[1]

---

[1] ایک علیؑ کا یہ نوٹ اس پر شبلی صاحب کا "جوہر شناس" قابل توجہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ علی بن ابی طالبؑ ان گورنروں کی گورنری ذرا دیر کے لیے بھی برداشت نہ کرتے تھے اور اس کو گناہ اور صریح آیت خدا کی خلاف ورزی جانتے تھے۔ بعض گورنروں کے نام اوپر مذکور ہو چکے ہیں ان کے اعمال و افعال پر نظر کر کے علیؑ تو بڑی چیز تھے۔ کوئی ادنیٰ مسلمان بلکہ کوئی عاقل ایک سکنڈ کے لیے ان سے رضامند نہ ہو سکتا تھا۔ ابن عباس اور دیگر مشورہ دہندوں کے جواب میں خود امیر المومنینؑ نے اپنا مطمح نظر واضح اور خوب صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

علیؑ اور اولاد علیؑ کا نظریہ ہمیشہ یہی رہا اور یہی فرق علیؑ اور غیر علیؑ کی حکومت اور اس کے نظریہ میں ہے اور اس امر کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اہلبیتِ رسول کی نظر میں وہ حکومت (چاہے کتنی ہی بڑی اور مستحکم ہو) کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس کی بنا استحصال بقا اور ترویج میں خلاف احکام الٰہیہ کوئی قانون، کوئی دفعہ یا کوئی عمل کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اہم اور مقدم پابندئ دین اور اسلام ہے برخلاف مخالفین کے کہ ان کا مقصد اصلی اقدام حکومت اور اس کا استحصال ہے اس مقصد کے لیے چاہے قوانین اسلامیہ کا انکار یا پس پشت ڈالنا یا خلاف اسلام امور کا ارتکاب (خواہ وقتی ہی طور پر ہو) اختیار کیا جائے اسی اصول کو ہر جگہ ملحوظ رکھنا چاہیئے، جس کا خلاصہ یہ ہے "مقدم دین" ہے یا "مقدم حکومت" ہے۔ یہ توجب ہے کہ جب مقدم کے بعد موخر بھی قابلِ توجہ ہو ورنہ غیر علیؑ کی حکومت میں تو اہمیت یا اقدمیت کا سوال ہی نہ ہوتا تھا۔ مقصد حقیقی حکومت اور صرف اقتدار تھا۔ تواریخ و احادیث میں اس کے شاہد

بکثرت ملتے ہیں۔ اب ایک صاحب انصاف کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ جو لوگ اسلام کے نمائندے، مسلمانوں کے حاکم، اسلامی شریعت کے محافظ، اسلامیات کے نگہبان ہونے کے مدعی ہوں ان کے لیے کیا زیبا ہے اسلامی اصول و فروع کی پابندی و ترویج یا نام اسلامی اور طریقے، قواعد، قوانین، عمل، عمال وہی کچھ جس کو مٹانے کے لیے اسلام آیا اور جسے ساری عمر سرورِ کائناتؐ قولاً و عملاً واضح کرتے رہے۔

امیر المومنینؑ نے لوگوں کے شورے پر صاف صاف ماکنت متخذ المضلین عضدا فرما دیا۔ لوگ اسے سیاسی کمزوری کہیں ہمیں اس سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ کتاب و سنت اگر قابلِ اتباع و تمسک مانی جائے تو اس کے متبع کے لیے یہی زیبا تھا اور ہے کہ گمراہی کی ہمت افزائی ہرگز نہ کرے۔ وہ بھی کوئی اسلامی حکومت ہوئی جس کے اصول کی قبر اُس کے اساس میں بنائی جائے، جس کے احکام کا جنازہ اُس کے حکام کے ہاتھ نکالا جائے۔ امیر المومنینؑ کو صرف رسولؐ کے مشن سے مطلب تھا جو الیوم اکملت لکم سے مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں کسی اصلاح و ترمیم کی گنجائش یا کوئی کمی باقی نہ تھی نہ ہے۔ صرف نام بدل کر حکومت قیصر و کسریٰ اور دولتِ سکندر و دارا کی بنیاد ڈالنا مقصود نہ تھی۔ اگر علیؑ کی حکومت بھی خالص دینی نہ ہوتی تو دوسروں کی حکومتوں سے علیؑ کی حکومت کو کیا امتیاز ہوتا کسی کی حکومت میں پچاس قانونِ اسلام توڑے گئے ہوتے کسی کی حکومت میں دس، کسی میں پانچ قانون اسلام۔ بہرحال خود اپنی حکومت میں لاوارث ناشدنی اور ناقابل عمل رہتا تو دوسرے اس کی پرورش کیوں کرتے (وہاں دعوائے اسلام

سمیت اسلامی قانون کی مہملیت کا دعویٰ اگر جمع ہو سکتا ہو تو پھر کوئی زحمت نہیں، خلاصہ یہ کہ دین و دیانت داری کے خلاف ایک آن کے لیے بھی علیؑ کا راضی نہ ہونا تھا نہ ہوئے، اور اگر اسلام کا مطمحِ نظر اسلام کے نام کی حکومت قائم کرنا ہوتا تو اُسی دن اس کا بہت اچھا موقع تھا جب عتبہ بن ربیعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "اے محمدؐ! تم جو مانگو میں دینے کو تیار ہوں، بشرطیکہ تم اپنے ادّعا سے باز آؤ۔ اگر تم کوئی حسین عورت چاہتے ہو تو میں اس کا انتظام کر دوں، اور اگر دولت اور مال کی طمع ہو تو میں چندہ کر کے اتنا مال دوں کہ تم قوم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر بادشاہت کی طمع ہو تو میں تمھیں قوم کا بادشاہ بھی بنا سکتا ہوں ۔۔۔ الخ۔ لیکن سرورِ عالمؐ اپنے ادعا سے باز آتے یہ کیوں کر ممکن تھا، آپ کی زبانِ مبارک سے وحی الٰہی کے یہ الفاظ برآمد ہوئے:

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود اور عتبہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔

کیا رسولؐ کے لیے حکومت اسلامیہ قائم کرنے کا نہایت اچھا موقع ہاتھ نہ آگیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے سکوت کر کے حکومت جما لیتے مگر حضرت نے اُسے بالکل ٹھکرا دیا اور اپنے ادّعا سے باز نہ آئے اپنے مشن میں لگے رہے۔ جس مقصد کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس کی تلقین و ترویج کے سوا آپ کو کوئی چیز دلکش نظر نہ آئی۔ حکومت کی اہمیت پر جان دینے والوں کے نزدیک رسولؐ کا یہ فعل بھی معاذ اللہ غلط ہی معلوم ہونا چاہیئے کیونکہ حکومت کی اہمیت اور اقدمیت تو یہ چاہتی ہے کہ وقت اور موقع تھا اس وقت چُپ ہو جاتے اور لوگوں پر مال و دولت

تسلّط واقتدار جما لینے کے بعد پھر دھڑلّے سے اسلام کی ترویج واشاعت فرماتے۔ اِس طرح وہ بیکس اور مظلوم شہدا ربھی بچ جاتے جو ضعف کے سبب مارے گئے۔ حکومت کے بعد کس میں دم تھا کہ مثلاً عمار کے والدین کو اس بے دردی سے قتل کرسکتا۔ مگر سرورِ دوجہاںؐ نے ایسی حکومت کی طرف ایک آن کے لیے رُخ نہ فرمایا اور نہ ہی جنگ کی۔ ایک اور واقعہ اِس طرح ہے جس میں اور تصریح ہے:

"کفارِ قریش نے مکرّراً جناب ابوطالب علیہ السّلام کے پاس آکر وہی درخواست کی جو پہلے کی تھی۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ اپنے بھتیجے کو نہ روکیں گے تو پھر ہم سے آپ سے ایسی شدید جنگ ہوگی کہ بالآخر ایک فریق فنا ہوجائے گا۔ یہ ابوطالبؑ پر بہت گراں گذرا اور انھوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ اے بھتیجے! لوگ ایسا ایسا کہتے ہیں، اس پر آنحضرتؐ کو خیال ہوا کہ (شاید) ابوطالبؑ میری رفاقت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ چچا! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں پر ماہتاب بھی رکھ دیں تب بھی میں اس امرِ حق سے باز نہیں آنے والا۔"

(ابوالفداء ج ۱ ص ۱۱۷، طبع حسینیہ مصر)

اس سے واضح ہوگیا کہ حضرت کو کیا چیز اہم اور عزیز تھی۔ آپ کو زمین اور آسمان کی حکومت مقدم نہ معلوم ہوتی تھی (ورنہ اس وقت چُپ ہوجاتے اور حکومت جما لینے پھر بقول شخصے اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے۔ جب یہ واضح ہے تو علیؑ بن ابی طالب جن کو اپنے تمام اعمال وافعال میں رسولؐ اور صرف رسولؐ کی پیروی محبوب ومطلوب تھی، حکومت دنیا اور اس کے گمراہوں کی ہمت افزائی یا ہمدردی یا اس

پر سکوت کیونکر فرما سکتے تھے۔ یاد کرو اس وقت کو جب جنگ احد میں لوگ رسولؐ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے اور اس وقت شدّت غضب سے آنحضرتؐ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ آپ نے حضرت علیؑ کو دیکھا جو آپ کے پہلوئے مبارک پر کھڑے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کیوں نہ بھاگ گئے۔ حضرت علیؑ نے عرض کی أ أکفر بعد الایمان ان لی بک اسوۃ (کیا میں ایمان لا کر کافر ہو جاتا، مجھے تو آپ کی تاسّی کرنا ہے) دیکھو مدارج النبوۃ، جلد ۲، ص ۱۲۱، نولکشور پریس ۱۹۱۴ء۔ اب کسی کو اشتباہ نہیں رہ سکتا کہ اہلبیتؑ کے نزدیک صرف ایک بات قابلِ توجہ، قابلِ عمل اور اہمیت کی تھی، یعنی تاسّی رسولؐ۔ لہٰذا ان کے اعمال کو دنیاوی معیار پر جانچنا یا اُنھیں ان دنیاوی چالوں کی رائے دینا جو دنیاداران محض کا مقصود ہوتی ہے یا ان عیّاریوں پر عمل نہ کرنے میں قابلِ اعتراض سمجھنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اصلی اور دینی وجہ تو وہی تھی، جو امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا۔ لیکن اگر سیاستِ دنیا کا بھی لحاظ کر کے دیکھا جائے تب بھی جو کچھ علیؑ نے کیا اسی کو عین مصلحت سمجھنا چاہیئے اس لیے کہ وہ حکام وہی تو تھے جن سے عام مسلمانوں کو حد درجہ نفرت تھی جن کے کرتوت سے مسلمانوں کے ناک میں دم آگیا تھا، شکایتوں پر شکایتیں کی گئیں۔ مگر جب دربارِ خلافت میں کوئی شنوائی نہ ہوئی تو بلوہ کی نوبت آئی اور ان اعمال کے حاکم اعلیٰ حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا۔ کیا اُسی ولید کو حاکم باقی رکھنا عقلاً دُرست کہا جائے گا جس کی نالائقی نے مصریوں کو بلوائی بنا دیا۔ کیا اُسی مروان کا اقتدار باقی رہنے دینا صحیح سمجھا جا سکتا ہے جس کے تسلّط نے

حضرت عثمان کی جان لی وغیرہ۔ اس کے علاوہ اُن حکام میں بعض تو ایسے تھے جن پر اپنی زندگی میں خود دو جہان کے سردار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتصریح مردود وملعون وکافر ہونے کا حکم لگا گئے تھے۔ ولید کا واقعہ یاد کرو۔ مصر کے عامل کا قضیہ دیکھو، ابن ابی سرح کے حال پر نظر کرو۔ اِس بنا پر زمانہ عثمان کے گورنروں کو معزول کرنا سیاست ظاہری کے اعتبار سے بھی یہ فوائد رکھتا تھا کہ وہ کل[1] بلوائی جو حضرت عثمان کی حکومت اور ان کے عمال کی ولایت سے تنگ تھے چُپ ہو جائیں۔ وہ کل[2] اصحاب خاص جو باقاعدہ پابند اسلام تھے وہ حضرت عثمان کے اس طرز عمل سے جو ان اصحاب کے ساتھ روا رکھا گیا تھا ناراض تھے۔ فی الجملہ آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ اور ذرا گہری نظر کیجئے جب وہ عمال اس درجہ بے وفا اور نمک حرام تھے کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے اور ان لوگوں کے پاس فوج، خزانہ سب کچھ تھا پھر بھی کسی نے اپنے محسن کی مدد نہ کی۔ تو حضرت علیؑ کو ایسے بے وفا اور نمک حرام لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے کہ حسبِ شہادت تواریخ وسیر خلاف حکم خدا اور رسول گلچھرے اُڑانے کے عادی اور مشاق ہو چکے تھے ان کو اسی طرح چھوڑا جاتا تو ان کے طغیان اور سرکشی میں اضافہ ہوتا اور اگر ٹوکا جاتا تو ظاہر ہے ان لوگوں کو کڑوا معلوم ہوتا اور سرکشی و فساد برپا کر دیتے۔ ان میں سے اکثر بلکہ تمام تر وہی لوگ تھے جو کھُلّم کھُلّا بنی ہاشم اور خصوصاً علیؑ بن ابی طالب کے

---

[1] یاد رہے کہ حضرت عثمان ۴۰ اور ۴۹ دن کے درمیان محاصرہ میں رہے۔ اگر میٹو اور خود غرض عمال مدد کرنا چاہتے تو بہت دور دور سے آکر مدد کر سکتے تھے۔

دشمن تھے (اگر پابند شریعت ہوتے تو نہ علیؑ کے دشمن ہوتے نہ علیؑ کو ان سے عداوت ہوتی)، جس کا ثبوت معزولی کے حکم سے اور اس سے پہلے ان لوگوں کے کردار و گفتار سے ملتا رہا۔ ایسے لوگوں پر آئندہ حکومت میں کیا اعتماد کیا جا سکتا تھا، یہ لوگ بھلا کا ہے کو علی کی سُننے والے تھے علیحدہ کر دینا ہی صحیح تھا ورنہ ساتھ رہ کر رعایا کو بگاڑ کر وقت پر دھوکا دے کر نہایت مُضر ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کرنے کے لیے کہ سب لوگ جان لیں کہ ان لوگوں کو (جن کو حکم معزولی دیا جا رہا ہے) اسلام یا مصالح دینیہ پیش نظر رکھ کر واجب الاطاعۃ خلیفہ کے (جو تمہارے خیالات کے مطابق جیسا بھی اجماع ہو اس کے ذریعہ خلیفہ مانا جا چکا ہے) احکام کی پیروی اور احترام عزیز نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود دنیا اور صرف حکومت ہے کیونکہ اگر ایسا نہ تھا تو اطاعت کا مقتضی یہی ہے کہ جیسا حکم ملے ویسا کرو۔ گویا بعقیدہ اہلِ سنت جو خلفاء راشدین کی اطاعت کو لازم قرار دیتے ہیں ان کے سامنے ایسے منکرین اور متفقین کے ایمان اور اسلام کی حقیقت بھی کھولنا تھی گویا ایسے لوگ بہ اتفاق شیعہ و سُنّی خارج از اسلام و ایمان ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مظہر العجائبؑ کے اِن احکام میں اور بھی اسباب و مصالح ہوں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت علیؑ کو روش دنیا بھی معلوم تھی۔ چنانچہ آپ نے فرما ہی دیا کہ مصلحتِ دنیوی تو وہی ہے جو تم کہتے ہو۔ مگر میری نظر عقلی مصلحتِ دین ہے۔ آپ نے اکثر فرمایا ہے "لولا الدین والتقی لکنت ادھی" (اگر دین کی پابندی اور خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں دیکھتا کہ مجھ سے زیادہ چالاک کون ہے؟) بہر حال آپ نے برابر سعی کی کہ دین مبین پھیلے مگر دنیا کو مقدم رکھنے والوں نے دنیا نہیں

بلکہ فتنہ پھیلایا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خبر دے ہی گئے تھے کہ علیؑ! تمھیں ناکثین، قاسطین اور مارقین سے مقابلہ و مقاتلہ کرنا پڑے گا بھلا الحق مع علی مرکون علی مع الحق والحق مع علی کے احکام دین داری کو سنتا تھا آپ کے خلاف اعلانِ جنگ ہو ہی گیا۔ قبل اس کے کہ علیؑ سرکش گورنروں کی سرکوبی کریں جنگ جمل آن پڑی۔ حضرت عائشہ کی کمان داری میں جناب طلحہ و زبیر کی جماعت نے جنگِ جمل کا رنگ جما دیا (جنگ کی ابتدا اس کے واقعات اور اس کا اختتام بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، اسلامی تواریخ دیکھیے۔ اتنی بات اس جگہ پر یاد دلا دینے کی ہے کہ حضرت عائشہ رسولِ خداؐ کی بیوی اور حضرت ابوبکر کی بیٹی تھیں، طلحہ و زبیر اہلسنت کے نزدیک عشرۂ مبشرہ میں داخل ہیں۔ طلحہ حضرت ابوبکر کے چچا کے بیٹے اور داماد تھے۔ اُمّ کلثوم بنت ابی بکر جو حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں طلحہ سے نکاح ہوا تھا۔ ان کی ماں ابوسفیان کی بیٹی معاویہ کی بہن تھیں۔ زبیر رسولؐ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے، یہ بھی حضرت ابوبکر کے داماد تھے، دیکھو تاریخ اسلام) مختصر یہ کہ جنگ جمل ہوئی اور بقول ابوالفدا طرفین سے دس ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔ بعض مورخین نے نقصان کی تعداد بیس ہزار تک لکھی ہے۔ بعضوں نے اکیس بائیس ہزار تک بیان کیا ہے۔ اس جنگ میں علیؑ نے جو شجاعت، شرافت و انسانیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ تاقیامت تاریخوں کے اوراق پر سنہرے حرفوں میں پڑھے جائیں گے۔ صاحب استیعاب نے رفاعہ بن رافع کے حالات کے سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا ہے کہ واللہ ان طلحۃ والزبیر[لہ] وعائشۃ لیعلمون

لہ لطیفہ اور خوش عقیدتی دیکھیے کہ باوجود اس کے حضرت علیؑ کے مخالفین کا نہ ساتھ چھوڑا گیا نہ اُن کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انی علی الحق وانھم مبطلون (بخدا کہ طلحہ وزبیر وعائشہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں اور وہ لوگ باطل پر) نتیجہ میں علیؑ کو کامیابی ہوئی برحق اور فاتح علیؑ نے شکست خوردہ اور ناحق مقتولین اور اسیران جنگ کے ساتھ جس شرافت کا برتاؤ کیا اس کا مقتضی تو غیرت دار ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن مفتوحین اور ان کے ورثہ اور ہمدردوں کے کیا رنگ رہے صاحبانِ واقفیت اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جمل کے ختم ہوتے ہی حاکم شام سے مقابلہ کی ٹھہری۔ رسولؐ کی پیشنگوئی کا ایک جزو ناکثین سے جنگ کا تمام ہوا۔ اب قاسطین کی باری آئی۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے اب تو براہ راست آپ خود بھی گورنر مقرر فرماتے ہیں۔ چنانچہ جناب کی طرف سے حمص میں عبدالرحمٰن بن خالد قنسرین میں، حبیب بن مسلمہ فہری اردن میں، ابوالاعور سلمی فلسطین میں، علقمہ بن حکیم کنانی، بحری علاقہ (سواحل) پر عبداللہ بن قیس فزاری۔ اب ظاہر ہے کہ ان صوبوں میں اتنی کافی مدت تک موقع پا کر کیا اقتدار اور تسلط حاصل کر لیا ہوگا اور اہلبیتؑ کے خلاف کیا کچھ سامان مہیا نہ ہو چکا ہوگا۔ اہلبیت طاہرینؑ کے لیے تو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ دوسرے ہی صوبوں میں ان کو کتنا یاد کیا جاتا تھا کہ معاویہ کے حدود حکومت میں ان کا کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

بُرا سمجھا گیا، نہ ان کو ناحق کہا جاتا۔ اگر خلافت اولیٰ، ثانیہ، ثالثہ میں علیؑ نے جنگ کی ہوتی تو ان عقیدت مندوں میں سے کتنے علیؑ کی خلافت مانتے اور مخالف کو باطل پر سمجھتے۔ اب یہ کہنا کہ لنا نازع لکما نازع معاویہ کی بانگ کو کیا کہا جائے۔

ذکر خیر کر سکتا۔ ان حدود میں تو یہ عالم کر دیا گیا تھا کہ لوگ معاویہ اور بنی امیہ سے زیادہ کسی کو رسولؐ کا قریبی رشتہ دار جانتے ہی نہ تھے۔ خود شام میں رسولؐ کے قریب ترین جگر پاروں کے متعلق یہ رنگ تھا کہ جسے مسعودی نے نقل کیا ہے:

"ہمارے بعض اہلِ علم بھائیوں نے بیان کیا کہ ہم لوگ ابوبکر و عمر و علیؑ و معاویہ کے متعلق بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے اور اہلِ علم کے اقوال بیان کیا کرتے تھے۔ عام لوگ بھی آیا جایا کرتے تھے اور ہماری باتیں سُنا کرتے تھے۔ آخر ایک دن ان میں سے ایک کہنے لگا جو ان سب میں زیادہ عقلمند بھی تھا اور اس کی داڑھی بھی بڑی تھی (غالباً سن رسیدہ ہوگا)، کہ بھلا تم لوگ علیؑ و معاویہ اور فلاں فلاں کا ذکر کب تک کرتے رہو گے۔ اس پر میں نے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے، کہا کہ علیؑ کے متعلق کیا کہتے ہو؟ اُس نے کہا وہی علیؑ نا جو فاطمہؑ کے باپ تھے۔ تب میں نے یہ بھی پوچھا کہ اچھا فاطمہؑ کون؟ اس نے کہا کہ نبیؐ کی بیوی عائشہ کی بیٹی معاویہ کی بہن۔ اب میں نے کہا کہ اچھا علیؑ کے متعلق واقعہ کیا ہے اُس نے کہا کہ وہ جنگ حنین میں رسول خدا صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کے ساتھ شہید ہو گئے۔"

(مروج الذہب برحاشیہ نفح الطیب جلد ۲ ص ۷۲ طبع ازہریہ مصر)

اس طرح اہلبیتؑ سے دنیا کو غافل بنا دیا جا چکا تھا، اور پھر طوق حکومت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک واقعہ تفریح خاطر کے لیے پیش ہے جس سے واضح ہو گا کہ یہ حکومت جسے عقیدت مند مسلمان اسلامی ہی کہے جاتے ہیں اور یہ فیصلہ

جیسے دینی ہی سمجھے جاتے ہیں صرف اپنے آدمیوں کی خاطر داری اور علیؑ کے (فرضی) ماننے والے کے لیے (چونکہ یہ شخص کوفہ کا تھا) اسلام اور احکام قرآن من لم یحکم بما انزل اللہ کی کیسی پابندی تھی اور اس کو حق کا پاس کتنا تھا۔

"ایک کوفی اپنے اونٹ پر سوار دمشق میں آگیا۔ سب لوگ صفین سے واپس ہو رہے تھے۔ چنانچہ ایک دمشقی لٹک گیا اور کہنے لگا کہ یہ اونٹنی تو میری ہے مجھ سے صفین میں چھینی گئی ہے۔ یہ مقدمہ معاویہ کے پاس پہونچا اور گواہی کے لیے دمشقی نے (اکٹھے) پچاس آدمی لاکھڑے کیے، جنھوں نے گواہی دی کہ بے شک یہ اونٹنی اسی دمشقی کی ہے۔ چنانچہ معاویہ نے کوفی کے خلاف (دمشقی کے حق میں) فیصلہ کر دیا۔ اب کوفی بولا کہ خدا تمھیں سنوارے (آنکھیں نہیں تو ٹٹول کے دیکھو) یہ اونٹ (نر) ہے اونٹنی (مادہ) نہیں ہے (جس کی سب گواہی دے رہے ہو) یہ سُن کر معاویہ نے کہا یہ حکم تو اب نافذ ہو چکا۔ (واقعہ چاہے کچھ ہو بات وہی رہے گی جو ہم نے کہہ دی۔)

(مروج الذہب برحاشیہ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۴۵ مطبوعہ ازہریہ مصر ۱۳۰۲ھ)

اسلام کی راستی اور راستبازی کی تعلیم ایک طرف اور اسلامی حکومت کے عمال اور ان کی کارستانیاں اس طرح کی دوسری طرف اور عوام الناس کا رنگ یہ کہ باوجود مسلمان ہونے کے ان امور کی طرف توجہ تک ندارد اُن کو روکنا ٹوکنا یا ان کے خلاف مرضی خدا و رسولؐ ہونے کا اعلان کس کو ضرورت یا کس کی طاقت تھی۔ دین خدا ایک بازیچۂ اطفال تھا۔ عبادات، معاملات سب میں اپنا استقلال و استبداد نسخ و ترمیم

جاری نوبت بایں جا رسید کہ جمعہ کی نماز دن دہاڑے بدھ کو ادا کر دی جاتی ہے۔ جہاں اس قسم کی اندھا دھند چلی ہوئی ہو۔ صراطِ مستقیم اور محجۂ بیضا پر چلانے والے ہادی مہدی علی بن ابی طالبؑ کی کیا چل سکتی تھی۔ رسولِ خداؐ خود بھی علیؑ کی اس صفت کا اعلان فرما چکے تھے اور جناب عمر نے بھی اس صفت کو مانا ہے۔

علیؑ راہ حق ہی پر چلانے والے ہیں

"حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد کون امیر بنایا جائے گا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر ابو بکر کو حاکم بناؤ گے تو انھیں امین اور دنیا میں زاہد اور عاقبت کا خواہاں پاؤ گے اور اگر عمر کو خلیفہ بنایا تو انھیں قوی اور امین پاؤ گے جو اللہ (کے کاموں) میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کریں گے۔ اور اگر تم لوگ علیؑ کو حاکم بناؤ گے، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرنے والے ہو۔ بہرحال اُن کو تم خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کی ہدایت کرنے والا پاؤ گے اور وہ تمھیں صراطِ مستقیم ہی کی طرف کھینچیں گے۔"

(یہ روایت مشکوٰۃ باب مناقب عشرہ میں بھی موجود ہے)

ایسی روایتوں سے شیعوں پر تو کوئی حجت نہیں البتہ اہل سنت پر لازم ہے کہ سرورِ عالمؐ جانتے تھے کہ یہ لوگ علیؑ کو خلیفہ بنانے والے نہیں اور اگر بنائیں تو ہدایت یافتہ ہدایت کنندہ پائیں گے۔ یہی صفت حضرت عمر نے بھی علیؑ کے لیے تسلیم کی ہے جب بقول اہلسنّت حضرت عمر سے خلیفہ نامزد کرنے کی درخواست کی گئی تو کہا:

"اے علیؑ! قسم خدا کی پس تم (خلافت کے اہل ہو) مگر (عیب) یہ ہے کہ تم خوش مزاج ہو۔ خدا کی قسم اگر تم والی ہو گئے تو تم سب کو حق واضح پر ہی چلانا چاہو گے اور شاہِ راہ مستقیم (نورانی) پر ہی لوگوں کو چلاؤ گے۔"

(ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۶۲ ذیل خطبہ شقشقیہ طبع مصر)

اب ظاہر ہے کہ چاہے جو کچھ بھی ہوا یا ہوتا علیؑ کو بہی (پابندیٔ حق) کرنا تھی اور یہی کیا (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون) اور دنیا داروں، ہوا پرستوں سے جو امید ہو سکتی ہے اس طرف سے وہی ظاہر ہوا، کھلم کھلا علیؑ پر سب و شتم کی گئی۔ بقول ابن خلدون وغیرہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ علیؑ بن ابی طالب، ابن عباسؓ، حسنؑ و حسینؑ اور مالک اشتر (علیہم السّلام) پر معاویہ نے لعنت کرنا اپنا شیوہ قرار دے لیا۔ (ترجمہ ابن خلدون جلد ۲ ص ۳۸۰) برسر منبر نماز جمعہ اور خطبوں میں نماز کے اندر قنوتوں میں ایسے کفر کے کلمات کہے گئے۔ لیکن سازش کام کر چکی تھی۔ اب کون تھا جو اِس امر شنیع کو بُری نگاہ سے دیکھتا۔ بانیٔ اسلام کو آنکھ بند کیے ہوئے ابھی تیس سال بھی نہیں گذرے کہ کھلم کھلا اُن کی تعلیم، اُن کا خاندان، اُن کی عترت، اُن کے اہلبیتؑ سب کی پوری طرح تذلیل ان لوگوں کے حکم اور حکومت میں ہونے لگی جو اپنے آپ کو دنیا کے سامنے بانیٔ اسلام کا پیرو، عزیز اور سچّا جانشین ظاہر کر رہے تھے[1]۔ حکومت اسلام میں ایسے مسلمان حاکم و رعایا سے رسولؐ کے قدم بہ قدم پیرو بلکہ نفسِ رسولؐ کو نصرت و حمایت کی کیا توقع

---

[1] پھر بھی مدعیان اسلام ان لوگوں کو سچا اور قابلِ اطاعت مان رہے ہیں۔

ہوسکتی تھی۔ علیؑ کی مخالفت کا وہ بیج جو حاسد منافقوں کے دل میں رسولؐ کی زندگی سے جم چکا تھا آہستہ آہستہ نشو و نما پارہا تھا، سقیفہ کی کارروائی نے اس پر خوب آبیاری کی۔ عداوتِ اہل بیت کا شجرۂ ملعونہ فی القرآن اب کافی مستحکم ہوچکا اگرچہ اس درخت کے پھل وقت بے وقت پہلے بھی دکھائی دیتے رہے، لیکن صفین کے میدان میں اپنی پوری مراد پر سربازار آگئے، ایک دو کا ذکر کیا ستر لڑائیاں لڑی گئیں۔ ایک طرف ابن آکلۃ الاکباد اور دوسری جانب بنتِ اسد و ابوطالب کا فرزند شیرِ خدا۔ آخر لیلۃ الہریر میں وہ رَن پڑا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے جناب مالکِ اشتر روحی وارواح المومنین لہ الفدا نے وہ کارِ نمایاں کیا جو قیامت تک یادگار رہے اس حملہ کی تاب معاویہ کی فوج کسی طرح نہ لاسکی بھاگنے کی ٹھانی۔ معاویہ کو بڑی گھبراہٹ ہوئی، عمرو عاص سے جو بقول شبلی صاحب کے سیاست و تدبیر کا قالب مجسمہ تھا کہا کہ کوئی تدبیر کرو نہیں تو اگر تھوڑی دیر ایسی ہی لڑائی رہی تو کہیں ہمارا نشان نہ ملے گا۔ عمرو عاص سے اور تو کچھ بن نہ پڑا یہ چال چلا کہ جتنے قرآن لڑنے والوں کے خیموں میں دستیاب ہوئے (بہ روایت مسعودی پانچ سو کی تعداد تھی) نیزوں پر باندھ کر لٹکوا دیے اور بہ آواز بلند کہلانا شروع کردیا "یہ کلام اللہ ہمارے تمہارے درمیان ہے"۔ مدعا یہ تھا کہ اس طرح لڑائی میں وقفہ اور لڑنے والوں میں اختلاف پڑجائے۔ اب کیا تھا جادو چل گیا۔ اشعث[1] بن قیس نے جسے بہ روایت حبیب السیر و روضۃ الصفا معاویہ نے بھاری رقم رشوت میں بھیج دی تھی اور اکثر قبیلے

---

[1] اس کا رشتہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔

اس کے تابع تھے اور بعض دیگر سرداران سپاہ نے جو معاویہ سے (علیحدہ علیحدہ بھی) رقمیں رشوت میں لے چکے تھے تیر اندازی بند کر دی۔ امیر المومنینؑ کی فوج میں کس قسم کے لوگ جمع تھے اس کی تصریح خود بہ زبان معاویہ سُنیے:

"معاویہ کا بیان ہے کہ میں نے علیؑ کے خلاف تین باتوں سے کام لیا (۱) وہ ایسے آدمی تھے کہ اکثر اپنا راز ظاہر کر دیتے تھے اور میں اپنا راز چھپائے رہتا تھا (۲) ان کو ایسی فوج ملی تھی جو حد درجہ خبیث تھی اور ان کی نہایت سخت مخالف تھی اور میں نے وہ فوج پائی تھی جو نہایت درجہ مطیع تھی اور میرے مخالف بالکل نہ تھی (۳) جب علیؑ نے اصحاب جمل پر فتح پائی اس وقت مجھے اس باب میں ذرا شک نہ تھا کہ (علیؑ دو میں سے ایک مصیبت میں ضرور مبتلا ہو گئے یا تو) اس کو ان کی فوج کے لوگ ان کی دینی کمزوری خیال کریں گے (یا) اگر جمل والوں کو فتح ہو جاتی پھر علیؑ کی شوکت (فوجی اقتدار) کمزور پڑ جاتی۔ یہ باتیں تو تھیں ہی ان کے علاوہ قریش مجھے علیؑ سے زیادہ اس لیے دوست رکھتے تھے کہ میں انھیں مال دیتا تھا اور وہ نہ دیتے تھے تو اب ان سے نفرت و علیحدگی کے کتنے سبب ہو گئے۔"

(استیعاب جلد ۱ ص ۲۶۴، حیدرآباد حرف میم حالات معاویہ)

جن لوگوں کو امیر المومنینؑ کے انصار اور فوج کی تعداد دیکھ کر شبہ ہوتا ہے وہ ہشیار ہو کر ان باتوں کو پڑھیں۔ اشعث اور از یں قبیل لوگوں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ امیر المومنینؑ کے طرف دار تھے بڑی بھاری غلطی اور تاریخی حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ آپ کی فوج میں بھی منافقین کی کثرت تھی جیسا کہ سرور عالمؐ کی فوج میں اکثر ہوا کرتی

تھی اور منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرۃ[1] تو قرآن مجید میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے لیے بتصریح ہی مذکور ہے۔ بہرحال نیزوں پر قرآن کا بلند ہونا تھا کہ رنگ ہی دوسرا ہوگیا۔ امیرالمومنینؑ اور آپ کے لشکریوں میں جن میں سے اکثروں نے معاویہ سے رشوت لے لی تھی (روضۃ الاحباب وحبیب السیر) جو گفتگو ہوئی وہ اس درجہ دردناک اور تاسف انگیز ہے جس پر ہر صاحب عقل کف افسوس ملتا ہے۔ امیرالمومنینؑ نے ہرچند سمجھایا مگر معاویہ کا دیا ہوا لقمۂ تر ان لوگوں کو عاقبت کی فکر کی طرف کب متوجہ ہونے دیتا تھا۔ ترجمہ ابن خلدون جلد چہارم ص ۲۶۴ مطبوعہ الہ آباد میں اس طرح مرقوم ہے:

"مصاحف نیزوں پر اٹھائے گئے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہم کتاب اللہ کے فیصلہ کو منظور کرتے ہیں۔ امیرالمومنین علیؑ نے للکارا، اے اللہ کے بندو! اپنے حق کے حاصل کرنے کو بڑھو اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں تامل نہ کرو کیوں کہ معاویہ، ابن ابی معیط، حبیب، ابن ابی سرح، ضحاک نہ صاحب دین و قرآن ہیں نہ صاحب ایمان ہیں، ہم ان کی حالت سے بخوبی واقف ہیں ہم ان کے لڑکپن اور بڑے ہونے کے بعد بھی صحبت میں رہے ہیں۔ لڑکپن میں وہ نہایت شریر لڑکوں میں سے تھا اور سن شعور پر پہونچ کر بھی بے حد شریر آدمیوں سے ہوا۔ افسوس تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے قرآن شریف کو براہِ مکر و فریب اٹھایا ہے، لوگوں نے

---

[1] تم سے وہ بھی ہیں جو دنیا کے دل دادہ اور وہ بھی جو آخرت کے خواہاں ہیں۔

کہا ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کتاب اللہ کی طرف بُلائے جائیں اور اس کو منظور نہ کریں۔ امیرالمومنین علیؑ نے ارشاد کیا ہم ان لوگوں سے اسی لیے لڑتے ہیں کہ کتاب اللہ پر عمل کریں کیونکہ انھوں نے اُس کو پس پُشت ڈال دیا ہے۔ مسعر بن فدک تمیمی اور زید بن حصین الطائی مع ان لوگوں کے جو بعد کو خوارج ہو گئے تھے بولے، اے علیؑ! کتابِ خدا کو قبول و منظور کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمھارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان کے ساتھ کیا تھا۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا، اگر تم میرے مطیع ہو تو برابر لڑتے رہو اور اگر باغی ہوا چاہتے ہو تو جو تمھاری سمجھ میں آئے وہ کرو۔"

ابن خلدون کے علاوہ روضۃ الصفا، حبیب السیر، تاریخ ابن واضح وغیرہ نے بھی بجز بعض لفظی اختلاف کے باتفاق یہی لکھا ہے۔ اس موقع پر ابوالفدا رج ۱، ص ۷۷) کی عبارت کثیر الفوائد ہونے کے سبب قابلِ غور و ملاحظہ ہے:

"مسعود تمیمی اور زید بن حصین الطائی نے اس جماعت سمیت جو بعد میں خوارج ہو گئے علیؑ سے کہا کہ دعوت دی جا رہی ہے تو تم کتابِ خدا کو مان لو ورنہ ہم تم کو مکمل دشمن کے حوالہ کر دیں گے اور تمھارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ابن عفان کے ساتھ کیا ہے۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ اگر تم ہماری مانتے ہو تو لڑے جاؤ، اور اگر نہیں مانتے تو پھر جو چاہو کرو، جو سمجھ میں آئے بناؤ۔ ان لوگوں نے کہا کہ اشتر کے پاس کسی کو بھیجیے کہ وہ لوٹ آئیں اس پر حضرت علیؑ نے ان کو بُلانے کے لیے کسی کو بھیجا۔ (وہ پہنچا اشتر کو کہاں یقین آنے والا تھا کہ علیؑ نے ایسے موقع پر روکا ہوگا) اس پر

اشتر نے کہا یہ موقع نہیں کہ تم جگہ سے مجھے ہٹاؤ۔ یہ سُن کر ایلچی واپس آیا اور علیؑ سے واقعہ بیان کر دیا، اس پر شور و غوغا ہو گیا۔ اُدھر اشتر کی طرف سے غبار بلند ہوا۔ ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آپ نے لڑنے ہی کا حکم دیا ہے۔ اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ تمھارے سامنے ہی تو بھیجا ہے بھلا تم نے مجھے دیکھا کہ اشتر کے پاس کچھ چُپکے سے کہہ کے بھیجا ہے جو کچھ میں نے کہا کیا وہ سب تم سُن نہیں رہے تھے (کوئی کاہے کو علیؑ کی کچھ سُنتا کسی بات کے جواب بغیر) پھر سب نے کہا کہ اشتر کے پاس بھیجیے کہ واپس آجائیں ورنہ ہم آپ کو معزول کر دیں گے۔ اب ایلچی پھر اشتر کے پاس آیا اور ان سے ساری حقیقت بیان کر دی۔ تب اشتر نے کہا کہ میں جان گیا قسم خدا کی قرآن کا اٹھانا اختلاف پیدا کر دے گا۔ یقیناً یہ مشورہ فرزند زانیہ کا ہے (مختصر یہ کہ) اب اشتر علیؑ کے پاس واپس آگئے۔ (جو لوگ وہاں جمع تھے کس نے کیا کہا تھا اس کی خبر تو مالک کو تھی نہیں سب کو اپنا ہی سمجھ رہے تھے) آتے ہی کہنے لگے کہ تم لوگوں کو دھوکا دیا گیا اور تم لوگوں نے دھوکا کھایا حالانکہ (مالک کو کیا پتہ کہ) یہاں پر جو لوگ جمع تھے ان میں اکثریت انھیں لوگوں کی تھی جنھوں نے خود ہی لڑائی سے روکا تھا۔ اور جب لڑائی رُک گئی تو معاویہ سے انھیں لوگوں نے پوچھا کہ قرآن کیوں بلند کیا ہے اس نے کہا کہ اس لیے کہ ایک حکم تم لوگ معیّن کرو ایک ہم مقرر کرتے ہیں اور ان سے عہد لیا جائے کہ وہ کتابِ خدا پر عمل

کریں۔ (اُسی کے مطابق فیصلہ کریں) پھر ہم لوگ ان کے متفقہ فیصلہ کی پیروی کریں۔ فریقین نے اُسے تسلیم کر لیا (بنے ہوئے تو تھے ہی کیوں نہ تسلیم کرتے اور اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ فوراً ہی) اشعث بن قیس جو خوارج کا سردار تھا بول اٹھا کہ ہم تو ابو موسیٰ اشعری کے حکم ہونے پر راضی ہیں۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ دیکھو پہلی بات میں تم لوگ میری مخالفت کر چکے اب بھی میری مخالفت نہ کرو میری رائے نہیں ہے کہ ابو موسیٰ کو حکم بناؤں۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ ہم ابو موسیٰ کے سوا کسی پر راضی نہیں۔ اس پر علیؑ نے واضح طور سے کہا کہ ابو موسیٰ قابل اعتبار آدمی نہیں ہے۔ ابن عباس ابو موسیٰ سے بہتر ہیں اس پر لوگوں نے کہا کہ وہ تو آپ کے چچا زاد بھائی ہیں اور ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جو تمھارے اور معاویہ کے لیے برابر ہو۔ اب علیؑ نے کہا تو پھر اشتر ان لوگوں نے اِس کا بھی انکار کیا اور یہ کہا کہ وہی تو اس جنگ کے بھڑکانے والے ہیں۔ اب علیؑ بالکل مجبور ہو گئے کہ ان لوگوں ہی کی بات مانیں چنانچہ اس مطلب کے لیے ابو موسیٰ کو فوج سے الگ کیا اور معاویہ نے عمرو عاص بن وائل کو الگ کیا اور حکمین علیؑ کے پاس آ کر ان کے سامنے اس طرح صلح نامہ لکھنے لگے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ وہ صلح نامہ ہے جو امیر المومنین علیؑ نے لکھوایا ہے وہ بول اٹھا کہ علیؑ تمھارے امیر ہوں گے، ہمارے امیر تو ہیں نہیں۔ اس پر احنف نے کہا امیر المومنینؑ کا نام تو ہم نہیں مٹائیں گے۔ اس پر اشعث بن

قیس بولا کہ یہ نام مٹا دو۔ آخر علیؑ کو ماننا پڑا اور آپ نے اس کو مٹایا۔ اور فرمایا کہ اللہ اکبر اُسی سُنّت کے مطابق ہوا۔ خدا کی قسم میں حدیبیہ کے دن رسول اللہ کا کاتب تھا اور "محمدؐ رسول اللہ" لکھا تھا، تو اُن لوگوں نے کہا تھا کہ آپ رسولِؐ خدا نہیں ہیں لہٰذا اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھئے۔ رسولؐ نے مجھ سے اس کے مٹانے کو کہا تو میں نے عرض کی کہ میری مجال نہیں کہ ایسا کرسکوں۔ آپؐ نے فرمایا اچھا مجھے دکھاؤ میں نے وہ جگہ دکھائی آپ نے اپنے ہاتھ سے اس کو مٹا دیا اور مجھ سے فرمایا کہ تم کو بھی ایسا ہی پیش آنے والا ہے اور پھر تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ اس پر عمرو عاص نے کہا کہ سبحان اللہ تم ہم کو کافروں سے تشبیہ دیتے ہو۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ کیوں زانیہ کے بچے تو کب فاسقین کا دوست اور مومنین کا دشمن نہ تھا۔ اس پر عمرو نے کہا کہ واللہ آج کے بعد ہم اور تم کبھی ایک جگہ اکٹھے نہ ہوں گے۔ تو علیؑ نے فرمایا کہ بے شک میں بھی امید کرتا ہوں کہ خدا میری مجلس کو تجھ سے اور تجھ ایسوں سے پاک رکھے گا، اس کے بعد صلح نامہ لکھا گیا۔"

(ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۷۷ طبع مصر)

اس موقع پر صاحب تاریخ اسلام نے بعض عیسائی مورخین کی رائے نقل کی ہے جو نقل کی جاتی ہے اور غور سے پڑھنے اور توجہ کے قابل ہے، (تاریخ اسلام ص ۲۰۵، باب پنجم طبع دہلی)۔

گبن لکھتا ہے کہ امیر شام بھاگنے کا تہیہ کر رہا تھا لیکن یہ یقینی فتح فوج

کے جوش اور نافرمانی کی بدولت علیؑ کے ہاتھ سے چھین لی گئی۔ علیؑ مجبور ہوئے کہ اُس پُر توہین صلح اور عیارانہ صلح کو منظور کریں، وہ رنج اور حقارت آمیز غصہ سے کوفہ واپس آئے۔ ایرونگ کہتا ہے اشترؔ اُنھیں یعنی شامیوں کو دباتا ہوا خیموں کے قریب لیے جا رہا تھا کہ شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کر دیے۔ علیؑ کے سپاہیوں نے تلواریں پھینک دیں، علیؑ نے اُن سے کہا کہ یہ فریب ہے اور لڑائی پر آمادہ کیا، لیکن انھوں نے انکار کیا۔ اشترؔ کو بُلا لیا گیا۔ جس وقت اس کے خنجر سے خون ٹپک رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اُسے شاندار فتح سے دھوکا دے کر روکا گیا۔ جورجی زیدان تمدن اسلام میں لکھتے ہیں کہ قریب تھا کہ علیؑ کے طرف دار معاویہ کے لشکر کو روند ڈالیں۔ عمرو عاص نے ایک ایسا حیلہ پیش کیا جس کے سبب سے خلافت اہل بیتؑ کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی امیہ نے من مانی مراد پائی، حیلہ یہ تھا کہ جب معاویہ کی فوج شکست کھانے کے قریب ہو گئی تو عمرو عاص نے حکم دیا کہ قرآن شریف نیزوں پر بلند کر کے صلح کی استدعا کی جائے۔ چنانچہ نیزوں پر قرآن شریف دیکھ کر حضرت علیؑ کی فوج کے لوگ دھوکا کھا گئے اور خود حضرت علیؑ سے التوائے جنگ کے لیے اصرار کرنے لگ گئے ناچار حضرت علیؑ کو جنگ ملتوی کرنا پڑی۔

اب جائے غور ہے کہ علیؑ کی فوج میں کس قسم کے لوگ آ گھسے تھے۔

اشعث بن قیس سے معاویہ نے ایک لاکھ درہم کا وعدہ بھی کر لیا تھا، اور بقول اعثم کوفی خالد بن معمرؔ کو امیر خراسان بنانے کا (نقل از تاریخ اسلام) اشعث خود قتل امیر المومنینؑ میں شریک (قبل ظہور خوارج ہی اس کا رنگ یہ تھا کہ

اکبر الخوارج کہا جا چکا) اس کے دو بیٹے قتل امام حسینؑ میں شریک، اس کی بیٹی امام حسنؑ کی بیوی بن کر اپنے شوہر فرزند رسولؐ کی قاتل۔ اصل یہ ہے کہ علیؑ کی فوج میں کچھ تو صاحبِ ایمان تھے اور زیادہ جاسوس، رشوت خوار دوست نما دشمن۔ بات یہ تھی کہ تعلیم اسلام کے خلاف اور اہلبیت رسولؐ کے خلاف جو اساس قائم کی گئی تھی اس پر یکے بعد دیگرے عمارت بلند ہوتی جا رہی تھی۔ خود غرضی، قوانین اسلام سے بے نیازی، پابندیٔ شریعت سے آزادی، اہلبیت رسولؐ سے محبت کے عوض ان سے غفلت، اجنبیت بلکہ عداوت و نفرت کی وبا پھیلتی چلی جا رہی تھی صرف محدود انسانوں کے سوا۔ جنھیں اصول و فرامین میں خدا و رسولؐ سے واقعی دلچسپی تھی عوام صرف نام بدل کر اپنے قدیم عقائد و اعمال کے دلدادہ ہوتے ہوئے دائرہ اسلام میں آگئے تھے اور جب حضرت علیؑ کی عام بیعت ہوئی تو قہراً گذشتہ سلطنت کی رعیت حضرت علیؑ کی رعیت اور گورنر یا قاضی یا فوجی حضرت علیؑ کے گورنر، قاضی اور فوجی کہلانے لگے۔ اب جو مخالف کھل گئے اُن کا اُسی وقت پتہ چل گیا اور بعضوں نے چالاکی سے موقع کا انتظار کیا اور عداوت کا اعلان کھلم کھلا نہ کر دیا۔ علامہ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح جلد اول ص ۱۱۶ پر بہ سلسلہ حالاتِ بسر جو لکھا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان ظاہری بیعت کرنے والوں کا (جن کی تعداد کتنی ہی کچھ ہو) رنگ باطناً کیا تھا۔

> "ایک قوم صنعاء میں تھی جو عثمان کی پیرو و طرف دار تھی اور ان کے قتل کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ لیکن نہ ان لوگوں کا کوئی سردار تھا نہ ان کا باقاعدہ کوئی نظام تھا۔ لہذا ان لوگوں نے جو دل میں تھا اُسے دل میں رکھا اور حضرت علیؑ کی بیعت کر لی۔"

اس قسم کی فوج یا رعیت پر کیا بھروسہ ہو سکتا تھا ورنہ اگر کہیں اعتباری آدمی ملتے تو دنیا دیکھتی کہ علیؑ وا ولاد کیا کر سکتی ہے۔ خود امیرالمومنینؑ نے فرمایا، ولٰکن لا رای لمن لا یطاع[1] اس کے علاوہ مختلف اوقات میں آپ نے جو تمنائیں کی ہیں اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو کن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ وقت نہیں بھلایا جا سکتا کہ جب آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے علاقوں پر معاویہ کے آدمی قبضہ کرنے لگے ہیں اور آپ نے اپنے نام نہاد طرف داروں کو اُبھارا اور وہ ٹس سے مَس نہیں ہوئے تو اُس وقت بہت تنگ دل ہو کر کیا کچھ نہ فرمایا۔ آخر فرمایا کہ:

"کاش! تم سب کے بدلے ہمیں بنی فراس بن غنم کے ایک ہزار سوار مل جاتے!" (نہج البلاغہ خطبہ ماھی الا الکوفہ)

لیکن چالیس ہزار بیعت کرنے والوں کے شمار میں ایک ہزار صاحبانِ اعتبار نہ نکلے۔ مختصر یہ کہ اہلبیتؑ کو ایسے ہی ناقابلِ وثوق مدعیانِ اسلام و ایمان سے سابقہ پڑا تھا، ان پر نہ تو بھروسہ ہی کیا جا سکتا تھا اور نہ (تاسی رسولؐ) ان کو منافق کہہ کر قتل یا فوج سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔

سیدالشہداء علیہ السلام کی غیر ممکن التوصیف اور عظیم الشان قربانی پر نظر کر کے نافہموں کی زبان پر بھی یہی جاری ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص یا امام بھی امام حسینؑ کی طرح لڑ کے مر کیوں نہ گیا۔ کانّنا ما کان لیکن یہ لوگ واقعات اور حالات سے یا تو قطعًا ناواقف ہوتے ہیں یا واقعات سے دانستہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے

---

[1] جس کی اطاعت نہ کی جائے اس کی بات کیا۔

کہ نتائج کا اندازہ کیے بغیر کسی اہم اقدام کا ارتکاب کوتاہ بینی ہے۔ حکمت و اخلاق کا مقتضی عقل و دیانت کا فیصلہ یہی ہے کہ ٹھیک ٹھیک وضع الشئی فی محلہ پر عمل ہو۔ شجاعت اور تہوّر میں امتیاز ضروری ہے۔ حلم اور جُبن میں فرق کرنا لازم ہے۔ آلِ رسولؐ کی فطری اور معدوم النظیر دانش مندی دحزم تہوّرانہ یا مجنونانہ حرکت سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی۔ اُن کا مطمحِ نظر صرف دین محمدی کا پھیلانا تھا اور اس کی دائمی بقا و استحکام کے سامان مہیّا کرنا تھے۔ اس لیے جس نے جب اور جو اقدام کیا برابر یہی (ترویج دین و تعلیم محمدیؐ) ملحوظ رکھا اور اس نقطہ سے ہرگز تجاوز نہ کیا خود سرورِ کائناتؐ اور امیر المومنینؑ کے مذکورۂ بالا حالات سے کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگا کہ امام حسین علیہ السّلام کے لیے جو علل و اسباب جان دیدینے کے تھے وہ امیر المومنینؑ، امام حسنؑ اور خود رسول اللہؐ کو حاصل نہ تھے، اور ان حضرات کے لیے جان نہ دے کر صبر و تحمّل سے کام لینے کے جو وجوہ تھے وہ امام حسینؑ کے وقت میں مفقود تھے۔

امیر المومنینؑ کو چار و ناچار بادل ناخواستہ خونِ جگر پی کر صلح کرنا ہی پڑی۔ اگر اُن روحانی اذیتوں پر نظر کی جائے جن کی ہلکی سی تصویر کشی امیر المومنینؑ نے اپنے بعض کلام میں کی ہے تو معلوم ہوگا کہ اگر حسینؑ نے جان دے کر دنیا کو محوِ حیرت بنا دیا ہے تو اصول (یعنی دین محمدیؐ کی پابندی اور ترویج کے لیے علیؑ نے بھی صبر کے موقعوں پر وہ کر دکھایا ہے جو حسینؑ ہی کے باپ کا کام ہو سکتا ہے۔ معمولی انسانوں کا تو ذکر ہی کیا دیگر انبیاء (سوائے خاتم الانبیاء) مل کر بھی ایسا نہ کر سکتے۔ خطبۂ شقشقیہ کے فقرات فصبرت وفی العین قذی وفی الحلق شجی، اری تراثی

نہبا وغیرہ[1] کس امر کی دلیل ہیں۔ معاویہ کے فرستادہ بُسر بن ابی ارطاۃ کے مظالم کی خبر پر جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے اُس کا ایک ٹکڑا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی خطبہ کے یہ فقرات کیسے جگر سوز ہیں :

"خدایا! میں ان لوگوں سے تنگ آگیا ہوں اور یہ مجھ سے تنگ ہیں انھوں نے مجھے عاجز کر رکھا ہے اور خود مجھ سے خفا ہیں"۔

"خدایا! ان کے بدلے مجھے اچھے لوگ دے اور میرے عوض انھیں ایسا آدمی دے جو ان لوگوں سے میری بہ نسبت بُرا برتاؤ کرے"۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی طرف داری کا دعویٰ کرنے والوں (بیعت کرنے والوں، رعیت یا سپاہی کہلانے والوں) میں کس قسم اور کس تعداد کے لوگ تھے۔ علامہ ابن ابی الحدید نے اس خطبہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خطبہ آپ کے اواخر خطب میں ہے۔ آپ نے یہ خطبہ اُس وقت فرمایا ہے جب صفین کی جنگ ختم اور حکمین کا معاملہ ہو چکا تھا۔ (شرح نہج البلاغہ ج ا ص ۱۱۰ تا ص ۱۱۵) ناظرین نوٹ کر لیں چند ہی دنوں بعد انھیں لوگوں سے امام حسنؑ کو سابقہ پڑے گا۔ پھر غور کرنا چاہیئے کہ ایسوں کو لے کر جنگ کرنے والا کیا پھل پا سکتا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے شکایات کی کوئی حد نہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے خطبہ میں فرمایا ہے : منیت بمن لا یطیع اذا امرت ولا یجیب اذا دعوت یعنی مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جنھیں حکم دیتا ہوں تو مانتے نہیں، جب بلاتا ہوں تو جواب تک نہیں

---

[1] اس حال میں میں نے صبر کیا کہ آنکھ میں کھٹک اور حلق میں اچھو تھا اپنی لٹتی میراث دیکھ رہا تھا۔

دیتےؔ[1] (بالکل نہیں سنتے)۔ اس کی تفصیل شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱ ص ۲۱۲ میں دیکھئے:

"جب تمھیں دشمن کے مقابلہ کو گرمیوں کے موسم میں کہتا ہوں تو کہتے ہو کہ شدّت کی گرمی ہے ذرا ٹھہر جائیے کہ گرمی گزر جائے۔ اور جب سردیوں میں کہتا ہوں تو کہتے ہو کہ چلّے کا جاڑا ہے ذرا دم لیجئے کہ سردی جائے۔ سردی گرمی سے بچنے کے یہ سب بہانے ہیں۔"

(ملاحظہ ہو تفصیل شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۴۰ خطبہ اما بعد فان الجہاد..... الخ) (اس کے علاوہ اسی شرح نہج البلاغہ کی ج ۲ ص ۳۸ و ج ۲ ص ۷۴ وغیرہ دیکھئے تو اندازہ ہو کہ علیؑ کی فوج کس قماش کی تھی)۔

الغرض جن دردناک الفاظ میں امیرالمومنینؑ نے ان منافقین کی ایذارسانی کی شکایت کی ہے ان سے دل تھرّا اُٹھتا ہے اور صاحب بصیرت کا جگر خون ہو جاتا ہے ان پر صبر اور ایسے لوگوں کے ساتھ گذارہ کرنا علیؑ ہی کا جگر تھا اس وقت جب حکمین فیصلہ کرنے چلے تھے، دونوں طرف سے چار چار سو آدمی اپنے نمائندے کے ساتھ تھے اس وقت کی حالت ابن خلدون (ترجمہ) جلد ۴ ص ۳۷۵ دیکھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں کہ عمروعاص کے ہمراہی، ہمراہیان ابن عباس سے اس درجہ زیادہ مطیع اور فرماں بردار تھے کہ جب کبھی معاویہ کا کوئی خط آتا تھا تو عمروعاص

---

[1] معاویہ کا قول اوپر گذرا یعنی علیؑ کے قول کی تصدیق دشمن نے بھی کی۔

سے اس کے مضامین کو دریافت تک نہ کرتے تھے، لیکن اہلِ عراق ابن عباس سے امیر المومنین علیؑ کے خطوط کے مضامین کو پوچھتے تھے اور ان کو اخفاء مضامین کے ساتھ متہم بھی کرتے تھے۔ اس موقع پر اُن آیات اور روایات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو زمانۂ رسولؐ کے مدعیانِ اسلام منافقین کے متعلق ہیں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ سچّے ایمان داروں میں دغاباز مار آستین کا خلط ملط صرف علیؑ کے لشکریوں کی خصوصیت نہ تھی بلکہ خود سرورِ کائنات کے اصحاب میں بھی یہی حال تھا بس فرق یہ تھا کہ رسولؐ کے مقابلہ میں اگر کسی کی ایسی کھُلم کھُلاّ طرفداری کی جاتی جیسی علیؑ کے زمانہ میں ہوئی تو ایسے لوگ کافر کہلاتے اور اوّلاً تو جو منافقت کا فائدہ تھا یعنی مل کر نقصان پہونچانا وہ اُن کو حاصل نہ ہوتا، ثانیاً جان سے بچ جاتے۔ مگر علیؑ کے مخالفوں کا ساتھ دینے والے کبھی تو خلیفہ کے طرفدار کہلا کے مسلمان رہے، کبھی اُمّ المومنین کے ساتھی کہلا کے مسلمان رہے کبھی خال المومنین کے طرفدار کہلا کر مسلمان رہے، کبھی زیادتی تعداد سے اجماع کے پابند ہو کر مسلمان رہے، اور اگر کچھ نہ ہوا تو سب سے بڑا عمدہ حربہ خطائے اجتہادی کے قلعہ میں محفوظ ہو کر مسلمان رہے اس لیے علیؑ کو رسولؐ کی تاسی کے علاوہ اس ذاتی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

علامہ ابن ابی الحدید اپنی شرح نہج البلاغہ جلد ۱ ص ۹۹ پر لکھتے ہیں:

"امیر المومنینؑ کے زمانہ میں اشعث منجملہ منافقین کے ایک تھا۔ یہ شخص امیر المومنینؑ کے اصحاب میں اُسی طرح تھا جس طرح عبداللہ بن ابی بن سلول اصحابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھا۔ (اشعث بن سلول) دونوں اپنے زمانہ کے سردارانِ منافقین میں تھے۔"

امیر المومنینؑ اور معاویہ کے درمیان جو صلح نامہ لکھا گیا ہے اس کے متعلق علامہ

ابن ابی الحدید کی عبارتِ ذیل اچھی خاصی بصیرت افروز ہے:

"جب حضرت علیؑ نے اپنے اور معاویہ و اہلِ شام کے درمیان صلح نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ معاویہ اور اہلِ شام کے متعلق یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ لوگ مومن مسلمان ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نہیں مانتا کہ معاویہ اور اہل شام مومن مسلمان ہیں معاویہ کو اختیار ہے جو چاہے جیسے چاہے لکھے اور اپنے اور اپنے اصحاب کے لیے جو چاہے مانے اور اپنا اور اپنے اصحاب کا جونام چاہے رکھ لے اس کے بعد لوگوں نے اس طرح معاہدہ نامہ لکھا یہ وہ حکم نامہ ہے جو علیؑ اور معاویہ کے درمیان ہوا ہے۔ علیؑ نے اہلِ عراق اور مومنین و مسلمین کی طرف سے جو ان کے تابع ہیں یہ طے کیا ہے اور معاویہ نے اہلِ شام اور ان مومنین و مسلمین کی طرف سے جو اس کے ہوا خواہ ہیں یہ طے کیا ہے کہ ہم لوگ حکمِ خدا اور کتابِ خدا کے پابند ہوں گے۔ کتابِ خدا ہی ہم دونوں کے درمیان جامع قرار پائے گی اور ہمارے لیے از ابتدا تا انتہا کتابِ خدا ہی معمول رہے گی (چنانچہ) ہم اسی کو زندہ رکھیں گے جس کو کتابِ خدا زندہ رکھنے کو کہے گی اور جس کو قرآن مارنے کو کہے گا اسی کو ہم بھی مُردہ بنائیں گے۔ اگر ایسی بات حکمین کو کتابِ خدا میں مل جائے تو اس کی پابندی کریں گے، اور اگر نہ ملے تو پھر ایسی محکم سنّت جس میں اختلاف نہ ہو (اس کی پیروی کریں)۔

دونوں حکم عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص ہیں۔ ان دونوں

نے علیؑ و معاویہ اور دونوں کی فوجوں سے کل بات کا وعدہ لے لیا ہے کہ ان کی جان و مال اور ان کے اہل محفوظ رہیں گے اور امت ان کی مدد کرے گی۔ یہ دونوں حکم کتاب و سنت کے موافق جو فیصلہ جس کے لیے کریں گے اس پر عمل کرنے کا خدا سے عہد طرفین کے سب مومنین و مسلمین اور ہر شخص کی طرف سے ہو چکا ہے اور جب تک فیصلہ نہ ہو اس وقت تک کے لیے طرفین سے امن قائم رکھنے اور صلح جوئی اور سلاح استعمال نہ کرنے پر اتفاق کر لیا گیا ہے اور دونوں حکموں پر خدا کی طرف کا عہد لے لیا گیا ہے کہ امت میں جو فیصلہ کریں گے وہ حق کا فیصلہ ہوگا خواہش نفسانی کی پیروی میں فیصلہ نہ ہوگا۔ اسی عارضی صلح کی مدت پورا ایک سال ہے۔ اب اگر حکمین چاہیں تو جلدی بھی فیصلہ کرنے کا ان کو اختیار ہے۔ اگر ان دونوں کا کوئی وفات پا جائے تو اس گروہ کے امیر کو یہ حق ہوگا کہ اس کی جگہ کسی اور ایسے شخص کو منتخب کر لے جو حق و عدل کے خلاف نہ کرے، اور اگر دونوں امیروں میں سے کوئی وفات پا جائے تو اس کے معین کرنے کا بھی اس کے اصحاب ہی کو حق ہے کہ جس کی حکومت کو وہ لوگ پسند کریں اور جس کے طریقہ کو ممدوح سمجھیں مقرر کر لیں۔ خدایا! جو اس صلح نامہ کے خلاف کرے یا اس میں بے دینی اور ظلم کا ارادہ کرے اس کے خلاف ہم تیری مدد کے خواستگار ہیں"۔

باوجودیکہ امیرالمومنین علیہ السّلام نے از اوّل تا آخر فوج کی بے وفائی اور

غداری و مکاری سے اعلان بیزاری کر دیا تھا اور کل خطرات کی تشریح کر دی تھی، پھر بھی جہاں تک آپ کا بس چلا ہے اس عارضی صلح نامہ میں ایسے شرائط رکھوا دیے کہ اگر ان کی کچھ بھی پابندی کی جاتی تو معاویہ کو کسی طرح کامیابی ممکن نہ تھی اور جو اصل مقصد تھا یعنی کتاب و سُنّت کی ترویج لوگوں سے اس کا اقرار لینا اور اس کا پابند کرنا اور کتاب وسُنّت ہی کے پابند کو ممدوح سمجھانا اور اس کے مخالف کو مذموم ثابت کرنا اور ان آوازوں کو عالم تک عموماً اور اہل شام و معاویہ شامیوں تک خصوصاً پہونچا دینا) اس کی پوری تبلیغ بھی ہو جاتی۔ لیکن جیسا کہ علی بن ابی طالبؑ نے بارہا علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ معاویہ اور اس کے ہوا خواہ نہ اہلِ دین ہیں نہ اہلِ قرآن اس قدر سخت اور پختہ واضح غیر مبہم عہد نامہ کی بالکل علانیہ مخالفت کی گئی۔ (یہ دوسری بات ہے کہ آج تک عقیدت مند مدعیان اسلام معاویہ کو حق ہی پر سمجھے جائیں لیکن ساری دنیا تو اندھی نہیں ہے) عمرو عاص اپنی چال چلا، اور ابو موسیٰ سے جنھیں شروع ہی سے علیؑ کی مخالفت تھی بآسانی اس کے ہمنوا ہو گئے اور قرآن و حدیث کی کھلی ہوئی مخالفت کا داغ جس طرح معاویہ اور عمرو عاص کے پائے نام رہ گیا۔ ابو موسیٰ بھی قیامت تک اپنی پیشانی سے اس داغ کو نہ چھڑا سکے۔ عمرو عاص اور ابو موسیٰ کی صلح کے وقت کی گفتگو تمام مورخین نے قریب قریب ایک سی لکھی ہے۔ ہم علامہ ابن ابی الحدید کی عبارت نقل کرتے ہیں:

"نصر نے بیان کیا ہے کہ ابو حباب کلبی کی روایت ہے کہ جب عمرو اور ابو موسیٰ مقام دومۃ الجندل پر ملے تو عمرو نے گفتگو میں ابو موسیٰ کو مقدم کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگا کہ آپ نے مجھ سے پہلے صحبتِ رسول کا شرف پایا ہے مجھ سے

سن میں بھی بزرگ ہیں۔ لہذا پہلے آپ فرمائیے میں بعد میں بولوں گا اور آپس کی گفتگو میں عمرو نے یہی قاعدہ اور عادت مقرر کر لی۔ مگر اس میں مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ صرف یہ مقصد تھا کہ ابوموسیٰ کو دھوکا دے کر پہلے بولوا دے اور اس طرح وہ علیؑ کے معزول کرنے کا پہلے اعلان کر دے اس کے بعد پھر جو اپنی رائے ہے وہ تو ہے ہی۔ اور کتاب صفین میں ابن دیزیل نے لکھا ہے کہ عمرو نے ابوموسیٰ کو صدر مجلس میں جگہ دی اور اس سے پہلے کوئی گفتگو نہ کرتا تھا اور نماز جماعت میں بھی اسی کو آگے کیا، کھانے میں بھی اسی کو مقدم رکھا کہ جب تک وہ نہ کھالے خود نہ کھاتا تھا، اور جب بھی ابوموسیٰ سے کلام کرتا تو اس کے لیے نہایت تعظیم کے آداب و القاب استعمال کرتا اور یوں کہتا کہ اے رسول اللہ کے صحابی۔ الغرض یہ حد ہوئی کہ ابوموسیٰ کو اطمینان ہو گیا اور یہ گمان کر لیا کہ عمرو ان کو دھوکا نہ دے گا۔ نصر راوی ہے کہ جب دونوں کے درمیان "ہانڈی میں خوب اُبال آچکا" تو عمرو نے کہا کیوں ابوموسیٰ آپ کی کیا رائے ہے؟ (دل میں علیؑ کی مخالفت تھی ہی اس پر عمرو عاص کی تعظیموں سے پھولے نہ سماتے تھے) فرمانے لگے کہ بندہ کی رائے تو یہ ہے کہ (علی علیہ السلام و معاویہ) ان دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کی کمیٹی پر پھر چھوڑ دیا جائے وہ لوگ جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ عمرو فوراً بول اٹھا خدا کی قسم رائے تو بس یہ ہے جو آپ نے تجویز فرمائی ہے۔"

(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۱۹۸)

اوپر جو صلح نامہ بیان کیا گیا ہے علامہ ابن ابی الحدید نے اس کے علاوہ اور بھی

روایتیں نقل کی ہیں۔ چنانچہ ایک میں یہ فقرے بھی ہیں :

"حکمین حکم کتاب اللہ سے ہرگز تجاوز نہ کریں گے اور اگر ان دونوں نے کتابِ خدا کی بات نہ مانی تو امت اسلامیہ ان سے بیزار ہو گی اور ان کے عہد کا کوئی اعتبار نہ ہو گا اور کسی قسم کی ذمہ داری نہ رہے گی"

لیکن با ایں ہمہ عمرو عاص نے جو چال اختیار کی وہ از سرتا پا خلافِ حکم کتاب و سنت رہی صاف صاف فریب، دھوکا اور مکر سے کام لیا۔ مسلمان تو مسلمان کوئی با عقل و شرافت انسان اس کو بجز نفرت و حقارت اور کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ ابوموسیٰ کو آخر آخر تک سمجھایا جا رہا تھا کہ فریب نہ کھائیں (مگر جب ارادہ بھی تو ہو، وہاں تو دل کسی اور ہی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ اشعث نے بے سمجھے بوجھے تو ابوموسیٰ پر زور نہیں دیا تھا) جب فیصلہ سنانے کا وقت قریب آ رہا تھا اور ابوموسیٰ نے کہا تھا کہ "ہم دونوں کی رائیں ایک ایسے امر پر متفق ہو گئی ہیں جس میں امید ہے کہ امت کی بھلائی اور صلاح ہو گی۔ عمرو عاص نے بھی اس کی تصدیق کی اور کہا کہ ٹھیک کہتے ہو۔ اے ابوموسیٰ آگے بڑھو اور جو طے ہے کہہ دو، جوں ہی ابوموسیٰ آگے بڑھے":

"تو ابن عباس ابوموسیٰ کے نزدیک چلے گئے اور فرمایا کہ اگر عمرو عاص نے تم پر یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کو تمہاری رائے سے اتفاق ہے تو واللہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس نے تم کو دھوکہ دیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عمرو عاص ہی کو تقریر کرنے کا موقع دو ورنہ پچھتاؤ گے ابوموسیٰ نے اس بات پر کچھ اعتنا نہ کی اور کھڑے ہو کر بعد حمد و ثنائے الٰہی کہا کہ ایہا الناس! میری اور عمرو عاص کی رائے متفق ہو چکی ہے کہ علیؑ اور

معاویہ دونوں علیحدہ کردیے جائیں اور مسلمانوں کا گروہ غور کرنے کے بعد جس کو چاہے اپنا خلیفہ مقرر کرلے۔ لہٰذا میں نے علیؑ و معاویہ دونوں کو معزول کیا اب تم لوگ اپنے آیندہ امور کی طرف متوجہ ہو کر جس کو اس امر کا اہل سمجھو مقرر کرلو۔ یہ کہہ کر پیچھے ہٹے اور عمرو عاص اُس جگہ کھڑا ہوا۔ خدا کی حمد و ثنا ظاہر کر کے یہ کہا کہ جو کچھ اُس شخص نے کہا وہ آپ لوگوں نے سُن لیا اور اس شخص نے اپنے والی کو معزول کر دیا۔ تو جس طرح اُس شخص نے معزول کر دیا میں بھی اس کے والی کو تو معزول کرتا ہوں لیکن اپنے والی کو ثابت کرتا ہوں"

(ابوالفدا ج ۱ ص ۱۷۸، مطبع حسینیہ مصر)

صحابیت کی اندھا دھند تعظیم ہی نے اسلام کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اہلبیتؑ کا غیر مشروط احترام جو بر بنائے بلندی ایمان و عمل صالح قرآن اور سرور عالمؐ کے فرمان میں بکثرت واجب قرار دیا گیا ہے پس پشت ڈالنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ کاش صحابیت کے ہر ہر بونگ میں ایمان و عمل صالح کی پرکھ بھی ملحوظ کر لی گئی ہوتی، اور ہمیشہ نہیں تو گاہے گاہے تو" ایمان و عمل صالح" کو قابلِ التفات سمجھا جاتا۔ لیکن ایمان و عمل کی کسوٹی اور صحابیت کا سن پروف (Sin Proof) دو متضاد حقیقتیں کیوں کر ملحوظ ہو سکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ ابو موسیٰ جن کا علیؑ سے انحراف مسلم ہے۔ (دیکھو استیعاب جلد ۲ ص ۶۷۸ کتاب الکنی حرف اللام والمیم طبع حیدر آباد) کیونکہ ان کو بھی تو علیؑ نے حکومت (کے لقمۂ تر) سے معزول کیا تھا۔ اِن صحابی صاحب کی دیانت کا حال تاریخ کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۵ کی اس عبارت سے بھی چلتا ہے:

"ابو موسیٰ اشعری معاویہ کے پاس بُرنس اسود (ایک قسم کی کالی

ٹوپی جو حکومت کے لوگ پہنتے ہیں) پہن کر آئے اور (معاویہ کو اس طرح سلام کیا) "السلام علیک یا امین اللہ" یعنی اے امینِ خدا تم پر سلام ہو۔ معاویہ نے وعلیک السلام تو کہا مگر جب ابو موسیٰ چلے گئے تو کہا کہ یہ بڈھا حکومت لینے آیا تھا۔ خدا کی قسم میں اس کو کہیں کا بھی والی نہ بناؤں گا۔"

ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ حضرت علیؑ کس درجہ مجبور ہو گئے تھے اگر صلح نہ کرتے تو کیا کرتے۔ یہ بھی[1] واضح ہے کہ امیر المومنینؑ کے اس عمل سے اسلام کو فائدہ ہی پہونچا، اگر آپ صلح نہ کر لیتے تو جیسا کہ ان رشوت خوار منافقین نے تصریح کر دی تھی آپ کو آپ ہی کی فوج قتل کر ڈالتی۔ جس فوج میں اشعث جیسے سردار ہوں، جس فوج کی طرف سے ابو موسیٰ جیسے لوگ حکم بنائے جائیں۔ جس فوج کا حال وہ ہو جس کی تصریح اور امیر المومنینؑ کی زبان سے ہو چکی، جس کی حالت خود معاویہ کی زبانی لکھی جا چکی۔ جس کی کارستانیاں تاریخ میں آج بھی باوجود اخفا بہ کثرت موجود ہیں اس فوج پر بھروسہ کر کے جنگ جاری رکھنا یا جنگ کر کے اپنے ہاتھوں اپنا اور اپنے مخلصین کا خون کرنا کب زیبا ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر مقتضائے دانشمندی یہی تھا کہ اپنے آپ نیز معدودے چند اصحاب خاص کو زندہ رکھ کر ان اصول اور احکام کو زندہ رکھا جائے جو انہی چند نفوس کے ساتھ وابستہ تھے اور معاویہ اور اس کے ہم رنگ جماعت کے ایمان و اعمال کو دنیا کے

---

[1] قرآن، حدیث، عقل سب کی اس طرح کھلم کھلا مخالفت کے باوجود معاویہ کے طرفدار مدعیان اسلام معاویہ سے علیحدہ یا علیؑ کے طرفدار نہ تھے، بلکہ آج تک معاویہ کو سراہے جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں سے امام حسنؑ کا آیندہ سابقہ ہونے والا ہے۔ کیا عقل اجازت دیتی ہے کہ حسنؑ بھی لڑ کر آزمودہ را آزمودن پر عمل کر کے مقصد اصلی کو فنا کر دیں۔

سامنے الم نشرح کر دیا جائے اور خاص کر وہ مدعیان پاکبازی مسلمان جنھوں نے صحابیت کے پردہ میں اسلام کشی کا بیڑا اٹھا رکھا تھا ان کے پردہ کو چاک کر دیا جائے اور واقعات میں ایسی نوعیت پیدا کر دی جائے کہ علیؑ اور اُن کے مخلص پیروؤں کی دین داری اور معاویہ اور اس کے ہم نواؤں کی مخالفت چھپائے نہ چھپ سکے۔ لوگ سمجھیں کہ ان دو لڑنے والوں میں دین اسلام، حکم قرآن اور سنت خیر الانام کا حافظ اور نگہبان خود پابند اور دوسروں سے اسی کی تمنا کرنے والا اور حکومت الٰہیہ کا حقدار کون ہے اور اس کے مخالف کون۔ چنانچہ مذکورۂ بالا طریقوں سے گو معاویہ کی حکومت ان حدود میں جم گئی جہاں برسوں قبل سے قائم کی گئی تھی۔ لیکن معاویہ کے حالات ایسے طشت از بام ہوئے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلمان بھی وہ کچھ لکھ گئے جو ایک غیرت دار مسلمان کے لیے عبرت کا تازیانہ ہے۔ ابو قیس ازدی کی روایت استیعاب یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو تین قسم کا پایا۔ ایک اہل دین جو حضرت علیؑ کو دوست رکھتے ہیں، دوسرے اہل دنیا جو معاویہ کو چاہتے ہیں، تیسرے خوارج۔

واہ رے اس زمانہ کے اصحاب اور تابعین اس قدر علی الاعلان کتاب خدا، سنت رسولؐ اور عہود اسلامیہ کی مخالفت و معاندت کی جاتی ہے معاویہ کا ساتھ نہیں چھوڑا جاتا (حکمین جب فیصلہ کے لیے جمع ہوئے تھے اس وقت دونوں طرف سے چار چار سو آدمی گئے تھے جن میں صحابہ کی کافی تعداد بھی موجود تھی۔) اس زمانہ کا تو ذکر ہی کیا کم از کم حکومت یا دستر خوان اور جاگیر و عطیہ کا لالچ تھا۔ تعجب تو آج کے عقیدتمندوں پر آتا ہے آج کچھ بھی نہیں رہا۔ پھر بھی اس شخص سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا جاتا جس کے حق میں علیؑ بن ابی طالب نے بے دینی کا اعلان کر دیا اور پھر

علیؑ کو بھی خلیفۂ راشد اور علی الحق کہا جا رہا ہے۔ حکمین کا فیصلہ ہو گیا، حکومتِ اسلامیہ کے دو ٹکڑے بن گئے۔ اب نیا شگوفہ یہ کھلتا ہے کہ وہی لوگ جنھوں نے علیؑ سے جنگ روکنے پر اصرار کیا، انھوں نے مالکِ اشتر کو بلانے پر اصرار کیا۔ علیؑ کی مرضی کے مطابق حکم مقرر نہ ہونے پر اصرار کیا۔ ابو موسیٰ کے حکم بنانے پر اصرار کیا، ان الحکم الا للہ کی بے جا صدا بلند کرنے لگے اور علیؑ کے مقابلے کے لیے ایک دوسرا گروہ اور تیار ہو گیا یعنی خوارج۔ امیر المومنینؑ نے علی الاعلان بتلا دیا کہ "دیکھو جن[1] دو حکموں کو تم نے اختیار کیا تھا اُن دونوں نے کتابِ خدا کے حکم کو پھینک دیا، جس بات کو قرآن نے مٹا دیا تھا انھوں نے اسے زندہ کر دیا۔ دونوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی، جو فیصلہ کیا نہ تو اس کی کوئی دلیل ہے نہ بیّنہ، نہ کوئی سُنّت ہے پھر یہ بھی کہ جو فیصلہ کیا اس میں اختلاف۔ مختصر یہ کہ دونوں نے گمراہی اختیار کی۔ لہٰذا اب جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ اور چڑھائی پر آمادہ ہو۔" ترجمہ ابن خلدون جلد چہارم ص ۳۸۲ پر یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

"امیر المومنینؑ کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے لشکریوں سے خوارج کی جنگ پر دوبارہ بیعت لی، پھر اُن کو حکمین کے فیصلہ کا خیال آیا جو شاق و ناگوار گذر رہا تھا، آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں بعد حمد و درود اور نصائح و پند کے بیان فرمایا اے لوگو! آگاہ رہو کہ حکمین نے قرآن کے حکم کو چھوڑ کر ہر ایک نے اپنی خواہش کی اتباع کی اور دونوں

---

[1] ابن ابی الحدید جلد ۱ ص ۲۰۰

نے فیصلہ کرنے میں اختلاف کیا، اور دونوں راہ راست سے علیحدہ ہوگئے،
پس اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسول اور صلحاء امت بری ہیں لہٰذا
تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔"

اس کے بعد ابن خلدون نے اسی عبارت کے سلسلہ میں یہ کہا ہے کہ :

" خطبہ دینے کے بعد خوارج کے پاس نہروان میں ایک فرمان لکھ
بھیجا جس میں اس خطبہ کا مضمون تھا اور ان کو اہل شام پر حملہ کرنے کو اُبھارا
تھا، صاف الفاظ میں لکھ دیا تھا نحن علی الامر الاول الذی کنا
علیہ (ہم اسی پہلی رائے پر ہیں جس پر اس سے پیشتر تھے یعنی اہل شام
سے جنگ کریں گے)۔"

خوارج نے جواب میں لکھا :

" تم نے بوقت تقرر حکمین اللہ تعالیٰ کا پاس نہ کیا اور اب اپنے
نفس کے اتباع سے لڑنے کو کہتے ہو۔ پس اگر تم اپنے کافر ہونے کا اقرار
کرو اور توبہ کرو تو ہم تمھارے ساتھ ہیں ورنہ ہم تم سے برابری کے ساتھ
لڑنے کو تیار ہیں۔"

امیر المومنین علیؑ کو اس خط کے پڑھنے سے ناامیدی ہوگئی، لیکن ان کو زیادہ[1]
مضر و خطرناک نہ تصور کرکے شام پر حملہ کرنے کا قصد مصمم کرلیا۔ لوگوں کو برابر جنگ

---

[1] قابل غور ہے کہ خوارج سے زیادہ خطرناک علیؑ کے نزدیک شامی تھے اور انھیں
لوگوں سے امام حسنؑ کا سابقہ ہوگا۔

کی ترغیب دینے لگے۔ ابن عباس کو لشکر گاہ نخیلہ سے فوج مرتب و مہیا کرنے کو لکھا انھوں نے ایک ہزار پانچ سو جنگ آور سپاہی بسر گروہی احنف بن قیس مجتمع کر لیا پھر دوبارہ ابن عباس نے لوگوں کو مجتمع کر کے امیر المومنینؑ کا فرمان پڑھا اور یہ بیان کیا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم لوگ ساٹھ ہزار ہو جس میں سے صرف ایک ہزار پانچ سو نے جنگ پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس قلیل تعداد کو میں کیا بھیجوں۔ اس فقرے کے تمام ہوتے ہی ایک ہزار چھ سو آدمیوں نے سینہ سپر ہو کر کہا، ہم جنگ پر جانے کو تیار ہیں۔ پس ابن عباس نے ان کو حارثہ بن قدامہ سعدی کے ساتھ روانہ کیا۔ چنانچہ احنف اور حارثہ تین ہزار ایک سو کی جمعیت سے امیر المومنینؑ کی خدمت میں جا پہونچے۔ امیر المومنین علیؑ نے اہل کوفہ کو جمع کر کے خطبہ دیا جس میں اہل بصرہ کی امداد کا حال بیان کیا۔ بعد ازاں نہایت نرم الفاظ میں پند و نصیحت کر کے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ میرے معاون و مددگار ہو، مناسب ہے کہ ہر سردار اپنے گروہ قبیلہ کی ایک فہرست تیار کر کے پیش کرے کہ ان میں کس قدر جنگ آور سپاہی ہیں۔ سعد بن قیس ہمدانی، معقل بن قیس، عدی بن حاتم، زیاد بن حصفہ، حجر بن عدی اور بڑے بڑے سرداروں رئیسوں نے بسر و چشم اس حکم کی تعمیل کی اور کسی متنفس کو جو قابل جنگ تھا باقی نہ چھوڑا۔ فہرست تیار ہونے پر معلوم ہوا کہ چالیس ہزار نبرد آزما تجربہ کار سترہ ہزار نوعمر، آٹھ ہزار خادم میدان جنگ میں جا سکتے ہیں۔ علاوہ ان کے تین ہزار ایک سو سپاہی بصرہ کے تھے۔ بعد اس کے امیر المومنینؑ نے یہ خبر پا کر کہ لوگ جنگ خوارج کو مقدم سمجھتے ہیں ارشاد کیا، اہل شام پر فوج کشی کرنا زیادہ ضروری ہے کیونکہ انھوں نے تم سے مقابلہ کیا، برابر لڑتے رہے۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ وہ بزور و جبر بادشاہ بن جائیں اور

بندگانِ خدا کو اپنا غلام بنائیں۔ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور متفق ہو کر بولے، ہم آپ کے ہمراہ ہیں، جہاں اور جس طرف مناسب سمجھئے رُخ کیجئے۔

ابھی امیر المومنینؑ اہلِ شام کی طرف روانہ ہونے بھی نہ پائے تھے کہ خوارج نے ہنگامہ برپا کر دیا، لوگوں نے امیر المومنینؑ کو پہلے خوارج سے نپٹ لینے کو کہا۔ امیر المومنینؑ کو مجبوراً خوارج سے پہلے اتمامِ حُجّت کرنا پڑا، چنانچہ خط و کتابت فہمائش شروع ہوئی۔ مورّخ ابن خلدون نے مختلف گفتگو جو خوارج سے ہوئی ہے بیان کی ہے اُن میں سے ایک یہ ہے جو ترجمہ جلد چہارم ص ۳۸۶ پر مذکور ہے:

"قیس بن سعد بن عبادہ اور ابوایوب انصاری نے یکے بعد دیگرے ان لوگوں کو وعظ و پند کیا، پھر خود امیر المومنین علیؑ نے خشونت آمیز الفاظ میں ان لوگوں کو سمجھایا، اِن کی رائے کی غلطی ظاہر کی اور حکمین کی نسبت فرمایا کہ چونکہ انھوں نے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ کے خلاف حکم دیا ہے اس وجہ سے ہم نے ان کے فیصلہ کو منظور نہیں کیا اور ہم اپنے اُسی خیال پر ہیں جو اس سے پیشتر تھا۔ علاوہ بریں حکم کے مقرر کرنے کو تم ہی لوگوں نے زیادہ زور دیا تھا۔ خیر جو گذرا گذرا، اب تم لوگ ہمارے ساتھ چلو اور دشمنوں سے لڑو۔ خوارج نے کہا، بے شک ہم لوگوں نے حکم کے مقرر کرنے میں غلطی کی، اللہ و رسول کے حکم کے خلاف کیا، کافر ہوئے۔ لیکن توبہ کر کے پھر مسلمان ہو گئے۔ پس اگر تم بھی توبہ کرو تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور اگر اس سے انکار کرو گے تو ہم تم سے مخالفت کریں گے۔"

لیکن تمام حُجتوں کے پورے ہونے کے باوجود بھی خوارج سیدھے نہ ہوئے

اور نہروان کی جنگ کو مقدم کرنا پڑا۔ اس جنگ کے حالات اور امیر المومنینؑ کے وہ معجزات جو اس جنگ میں ظاہر ہوئے ہیں قابلِ دید ہیں۔ مختصر یہ کہ اس جنگ میں بھی علی علیہ السّلام کو شاندار کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد کے متعلق علاّمہ ابن خلدون یہ لکھتے ہیں:

"نہروان جنگ سے فارغ ہونے کے بعد امیر المومنین علیؑ کا قصد اہلِ شام کی طرف بڑھنے کا تھا، لیکن لشکریوں نے تھک جانے اور تیر اور نیزوں کے زخموں کی شکایت کی اور کوفہ میں واپس چلنے کی درخواست کی تاکہ چندے آرام کر کے دشمنوں پر کمال مردانگی و مستعدی سے حملہ کریں۔ شاید اس اثنار میں ہماری تعداد بھی بڑھ جائے۔ اس گفتگو کے کرنے پر اشعث بن قیس[1] مامور کیے گئے تھے۔ امیر المومنین علیؑ نے اس امر کو منظور نہ کیا۔ ساتھ ہی اس کے شام کی طرف بھی نہ روانہ ہوئے بلکہ کوفے کو لوٹے اور مقام نخیلہ میں پہونچ کر قیام کر دیا اور عام حکم دے دیا کہ کوئی شخص اپنے مکان پر نہ جائے جب تک دشمنوں کی طرف خروج نہ کر کے فتحیاب ہو آئے۔ لیکن زمانہ قیام لشکرگاہ میں اکثر لوگ لشکرگاہ خالی چھوڑ کر اپنے اپنے مکانوں پر چلے آئے ـــــ امیر المومنین علیؑ چھاؤنی کو خالی دیکھ کر ان لوگوں کے پاس آئے اور دوبارہ لڑائی کی ترغیب دی، معدودے چند آدمیوں نے مستعدی ظاہر کی پھر چند روز ٹھہر کر اُس کے سرداروں اور رئیسوں کو طلب کر کے ان کی رائے

---

[1] اگر علم غیب نہیں مانا جائے تو بھی تجربہ سے ثابت ہو چکا کہ اشعث کا ظاہر کیا تھا باطن کیا تھا۔ ایسے شخص کی رائے پر بھروسہ کیوں کر کیا جا سکتا تھا۔

دریافت کی اور تاخیر کرنے کی وجہ استفسار کی۔ ان لوگوں میں سے نہایت کم آدمیوں نے شام پر فوج کشی کی خوشی ظاہر کی۔ امیرالمومنین علیؑ کا چہرہ اس سے سُرخ ہوگیا۔ ملول خاطر اُٹھے، خطبہ دیا، سختی سے تقریر کی، اُن کے فرائض سے ان کو مطلع کیا، نصیحت فضیحت بہت کی لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی بُت کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔"

حالات سے ناواقف لوگ خصوصاً غیر مسلم مورّخین جو زیادہ تر محض انہیں ادر اتنے ہی حالات سے مطلع ہوتے ہیں جو جناب امیر علیہ السّلام کے مخالف کیمپ سے نکلتے ہیں اور جنھیں یہ قطعاً معلوم نہیں کہ خلافت کے معاملہ میں اگرچہ حضرت علیؑ کو چوتھی جگہ شمار کیا جاتا ہے مگر (باوجود اس وقت خلیفہ ماننے کے بھی) اُن سے ویسی ہمدردی نہیں جیسی گزشتہ خلفاء سے تھی، بلکہ علیؑ سے تو اُن کے مخالف (مگر مدّعیانِ اسلام) مسلمانوں کو اتنی بھی ہمدردی نہیں جتنی معاویہ سے ہے۔ حضرت علیؑ کے لیے اس موقع پر تاخیر جنگ کا الزام لگانے والے غور نہیں کرتے کہ ایسی فوج کے بل پر کیونکر لڑائی لڑی جا سکتی تھی۔ علامہ ابن خلدون جو مورخین میں مخالفت اہلبیتؑ کا بڑا پکا علمبردار ہے ابھی اس کی تحریر ملاحظہ کی گئی اس کے بعد بھی کسی اعتراض کا محل حضرت علیؑ کے حق میں ہو سکتا ہے، ہرگز نہیں!

جب امیرالمومنینؑ کی نصیحت فضیحت امر زجر کسی کا اثر نہ ہوا تو آپ مجبوراً دارالسّلطنت (کوفہ) کی طرف لوٹے۔ تاریخ اسلام باب ۵ ص ۲۰۲ سے واضح ہوتا ہے کہ حکمین کے قضیہ کے بعد ایک خط و کتابت امیرالمومنینؑ اور معاویہ سے ہوئی

ہے اور معاویہ کی روزانہ کی غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ معاہدہ بھی وقتی طور پر ہوا ہے کہ شام و مصر میں معاویہ اور عراق و دیگر اسلامی علاقوں میں علی مرتضیٰؑ کا قبضہ رہے۔ وہاں پہونچ کر شام پر حملہ کی فکر ہی میں تھے کہ اسی اثنار میں دشمنوں کی سازش نے اپنا کام پورا کرلیا۔ نفسِ رسولؐ پر جب آپ روزہ رکھے ہوئے مسجد میں نماز میں مشغول تھے کہ اشقی الآخرین عبدالرحمٰن بن ملجم کی زہر آلود تلوار چل گئی اور آپ خدمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جا پہونچے۔ سازش کے ایک جزو برک کو معاویہ پر حملہ کرنے کے جُرم میں گرفتار کیا گیا تو بقول ابن اثیر (ج ۳، ص ۱۵۷) اس نے معاویہ سے خطاب کیا کہ میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ بتلائیے اگر خوشخبری سناؤں تو مجھے اس سے کوئی فائدہ پہونچے گا۔ اُس نے کہا ہاں! ۔ تب اس نے کہا کہ میرے ایک بھائی نے آج ہی رات کو علیؑ کو قتل کر ڈالا۔ معاویہ نے کہا ممکن ہے کہ اس کو موقع نہ ملا ہو۔ برک نے کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے، علیؑ کے ساتھ تو کوئی محافظ نہیں ہوتا (اس روایت میں اس کے بعد اس کو قتل کیے جانے کا حال لکھا ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ (یہ سُن کر) معاویہ نے برک کو قتل سے معاف کردیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور وہ اس وقت تک زندہ رہا جب کہ زیاد بصرہ کا حاکم ہوا اور برک وہاں رہا۔ اُس کی اولادیں بھی ہوئیں۔ مختصر یہ کہ خواہ کسی کی سازش رہی ہو علیؑ کی شہادت واقع ہوگئی۔ تاریخ اسلام میں ہے:

"مسعودی کہتا ہے کہ بعض لکھتے ہیں کہ وفات کے وقت علی مرتضیٰؑ نے امام حسنؑ اور اُن کے بعد امام حسینؑ کو اپنا وصی کیا کیونکہ آیۂ تطہیر میں یہ بھی حضرت کے ساتھ شریک ہیں اور یہ قول اکثر اُن لوگوں کا ہے جو نص کے قائل

ہیں۔ العقد الفرید، روضۃ الاحباب، حبیب السیر، وسیلۃ النجاۃ، ملا مبین، نزول الابرار اور سرا الجلیل مولوی عبدالعزیز دہلوی میں بھی یہی ہے کہ حضرت علیؑ نے وقت وفات امام حسنؑ کو اپنا جانشین کیا تھا۔ ابوالفدا، طبری، مسعودی اور ابن اثیر و ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے کہ (جب آپ زخم کھائے پڑے ہوئے تھے) لوگوں نے حضرت سے پوچھا کہ یا حضرت اگر خدانخواستہ آپ کا انتقال ہو جائے تو ہم حسنؑ کی بیعت کر لیں؟ حضرت نے فرمایا میں تو کچھ ہاں یا نا نہیں کہتا، تم خود ہی سمجھ دار ہو۔"

امیرالمومنینؑ کی شہادت کے بعد خواہ بہ وصیت و خواہ بہ بیعت اب امام حسن علیہ السلام کی خلافت ان حالات میں شروع ہوتی ہے۔ اشعث نے جنگ نہروان کے بعد امیرالمومنینؑ کی رائے جنگ اہل شام کی کھلم کھلا مخالفت کی وہ ظاہر ہی ہے۔ سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کے اندر کتنے اور رہوں گے، اور بقول ابن خلدون امیرالمومنینؑ کے اصرار اور نصائح و فضائح کے باوجود لوگ چھاؤنی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایسے بھاگے کہ باوجودیکہ امیرالمومنینؑ خود اُن کے پاس گئے، پھر بھی "نہایت کم آدمیوں" نے آمادگی ظاہر کی جس سے آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ شام پر حملہ میں یہ کیت و لعل جاری تھی کہ امیرالمومنینؑ کی شہادت ہوئی۔ مذکورۂ بالا حالات سے خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ امام حسنؑ کو کتنے اور کیسے سپاہی ملے اور ان کو لے کر کیا اہم اقدام ہو سکتا ہے۔ ادھر تو حسنؑ کے گھر علیؑ کا ماتم تھا اور پھر ایسے نامعقول اور ناہنجار سپاہیوں کا ساتھ تھا۔ آپ کی خلافت کا ہونا تھا کہ معاویہ ایک دم ساٹھ ہزار فوج لے کر امام حسنؑ کے مقابلہ

کے لیے مقام مسکن پر آپہونچا۔

چونکہ میرا خطاب ابھی تک شیعوں سے ہے اور صرف ان کی تسلّی کے لیے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں بتانا چاہتا ہوں کہ امام کے معصوم مفترض الطاعۃ ہونے سے اگر قطع نظر بھی کی جائے جب بھی مقتضائے اصول و دانش مندی یہی تھا، یعنی صلح کر لینا اور اسی امر کو ملحوظ رکھ کر رسول خدا اور علی مرتضیٰؑ کے حالات صلح لکھے گئے ہیں کہ اگر صلحِ حسنؑ قابلِ اعتراض ہے یا سمجھ میں نہیں آتی تو پھر وہی اعتراض رسولؐ اور وصی رسولؐ پر بھی کیوں نہیں کرتے صرف امام حسنؑ ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ یہ بار بار عرض کر چکا کہ ان حضرات کے اقدام کو حکمت، عدالت، شریعت اور انسانیت کے قانون کا لحاظ کر کے دیکھنا چاہیئے، صرف نام آوری اور دکھاوے کی شجاعت اور ہوائے نفس و زمانہ کی پابندی یہ حضرات ہرگز نہ کرتے تھے نہ ان کو ایسا زیبا تھا، نہ ان کا مقصد ایسی سلطنت قائم کرنا تھا جس کا نام تو اسلامی ہو اور اس کے احکام اور حکام کا عمل خدا و رسولؐ کے خلاف حکم ہو۔ صاحبِ تاریخ اسلام نے اس موقع پر ایک سوال نقل کیا ہے اور خود امیر المومنینؑ کا جواب بھی نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"صفّین سے واپسی کے وقت راستہ میں عبد اللہ بن ودیعۃ الانصاری جناب امیرؑ سے ملے اور کہا کہ اکثر لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے بقیہ اطاعت شعاروں کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کیوں نہ کی، فتح پاتے یا شہید ہو جاتے۔ نافرمانوں کی آپ پروا نہ کرتے۔ حضرت نے فرمایا، حسنؑ و حسینؑ شہید ہو جاتے اور نسل پیغمبرؐ قطع ہو جاتی اور یہ مجھے منظور نہ ہوا حسینؑ کے بعد عبد اللہ بن جعفر اور محمد بن حنفیہ بھی شہید ہو جاتے اب میں کسی جنگ

میں انھیں ساتھ نہ لے جاؤں گا۔" (کامل ابن اثیر، مطالب السئول، ارجح المطالب)

امیرالمومنینؑ کا یہ جواب بظاہر ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہو کہ یا فتح یا شہادت اس کے لیے یہ کیا دشوار تھا کہ ان حضرات کی شہادت کے لیے کہہ دے کہ میں تو یہ کہہ ہی رہا ہوں کہ یا فتح یا شہادت آپ بھی شہید ہو جاتے یہ حضرات بھی ہو جاتے لیکن سائل کا سکوت بتلاتا ہے کہ سائل نے اس جواب کو تسلی بخش پایا اس سے اصل مقصود معلوم ہو گیا۔ مطلب یہ تھا کہ تم نے دو صورتیں بیان کیں، یا فتح یا شہادت۔ تو فتح کی تو ان معدودے چند اطاعت شعاروں کے ساتھ جنگ کرنے میں کوئی اُمید ہی نہ تھی۔ دنیا دارالاسباب ہے۔ اس طرف کے اگر لاکھ نہیں تو ہزاروں کے مقابلہ میں ادھر کے چند مارے ہی جاتے۔ چنانچہ حسنؑ و حسینؑ، عبداللہ و محمد سب مارے جاتے لیکن ان کا مارا جانا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ وقت ایسا ہے کہ ان کا بچانا زیادہ اہم ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ آیندہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے ان لوگوں کو کسی جنگ میں ساتھ لے جانے سے احتیاط کا ارادہ ہے۔ کہنے والا اب بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا بات ہوئی نسل رسولؐ قطع ہو جاتی، ہو جاتی۔ یا کم از کم عبداللہ اور محمد حنفیہ کے لیے تو آپ نے قطع نسل کی توجیہ بھی نہیں کی۔ وہ مارے جاتے ہیں تو مارے جانے دیجئے۔ مگر سائل نے اس کا موقع نہ پایا۔ حالات پیش نظر تھے وہ جان رہا تھا کہ نسل رسولؐ کے منقطع ہونے میں کیا خرابی ہے اور عبداللہ و محمد کے شہید ہونے سے کیا بگڑتا ہے، اُسے معلوم تھا۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ نسلِ رسولؐ کا انقطاع یا عبداللہ و محمد کے سے حضرات کی شہادت کا مطلب اُس دین کا فنا ہو جانا ہے جس کی حفاظت کے لیے علیؑ جنگ کر رہے ہیں، کیونکہ دین حقیقی رسولؐ صرف

نسلِ رسولؐ اور اُن کے معدودے چند مخلصین کے ساتھ وابستہ ہے نہ دینِ رسولؐ اُن سے جُدا ہو سکتا ہے نہ وہ دین سے جُدا ہو سکتے ہیں (انھما لن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض) تو ان کے قتل کے یہ معنی ہوتے کہ رسولؐ کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ گو ظاہر میں تو یہ کہہ کر خوش ہو جاتے کہ علیؑ نے بڑی بہادری کی جان دے دی۔ لیکن دور بین اور حقیقت شناس آنکھیں صرف دنیا کی تعریفوں پر نہیں للچاتیں، اس طرح رسولؐ کا مشن فیل ہو جاتا اور صرف وہی دین بلا کسی روک ٹوک اور کسی مقابل کے باقی رہ جاتا جو معاویہ اور اس کے ہمنگوں کے پاس تھا۔ لیکن علیؑ کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ صرف ظاہر بین انسانوں کی تعریف کے لیے اس دین کو ڈبو دینے جسے اپنے بچپن سے خون پسینہ ایک کر کے محفوظ رکھا تھا اور رسول خداؐ جس کا امین آپ کو بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اصل میں اس اصول، اس مشن اور اس دین کی حفاظت عزیز تھی جو خاتم النبیین لے کر آئے تھے اور جس کے محافظ اہلبیتؑ اور صرف اہلبیتؑ تھے، اور جس کی بقا کے لیے امیر المومنینؑ جنگ کر رہے تھے یہ مقصود ہرگز نہ تھا کہ ملک فتح ہوتا یا شہادت کا تمغہ ملتا۔ شہادت بھی تو اسی لیے قابلِ قدر ہے کہ وہ دینِ حق کے بقا کا سبب ہے جو اصل مقصود ہے۔ اور جب اصل مقصود ہی مفقود ہو گیا، تو ایسی شہادت کس کام کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب عوام کی آنکھوں پر اتنا گہرا پردہ پڑ چکا کہ عمّار کے قتل کا سبب معاویہ علیؑ کو قرار دیتا ہے اور مدعیان اسلام اس کے جواب سے راضی ہو جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح کی شہادت میں حسنؑ، حسینؑ، محمد حنفیہ کا قاتل علیؑ کو قرار دے دیا جائے۔ ممکن ہے بہانہ خونِ عثمان کی طرح جب زمانہ

اندھا ہی ہو گیا ہے خون فرزند رسولؐ کا بہانہ نکال دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ فرزندانِ رسولؐ کس کے ہم رائے تھے اور جن کے لیے سردرِ عالمؐ کی متواتر حدیثیں شاہد فضل ہیں وہ کس کے پیرو اور ان کی حفاظت کس کے ذمہ ہے، وغیرہ۔

چونکہ اِس کتاب کے اِس حصہ میں تخاطب صرف شیعوں سے ہے اس بنا پر رسولِ خداؐ اور امیر المومنینؑ کے حالات کو تمہیداً پیش کیا گیا۔ امیر المومنینؑ کے یہاں تک کے حالات کے بعد امام حسنؑ کا سابقہ ایسی اُمّت ایسی رعیّت اور اسی دشمن سے ہوتا ہے جس سے ابھی ابھی کل پرسوں تک علیؑ کو سابقہ پڑا تھا، امام حسنؑ ایسے لوگوں سے کیا توقع کر سکتے تھے یا امام حسنؑ کے ساتھ ان لوگوں کو کیا ہمدردی ہو سکتی تھی خود بخود واضح ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم امام حسنؑ کی معاویہ سے صلح کا حال لکھنا شروع کریں مناسب خیال کرتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اور معاویہ کے متعلق بعض مورخین کی رائیں نقل کریں تاکہ آیندہ رائے قائم کرنے میں سہولت ہو اور اندازہ ہو سکے کہ علیؑ کو ایسی دشواریاں تھیں تو علیؑ کے نقشِ قدم پر چلنے والے کو کیا دشواریاں ہوں گی درانحالیکہ حسنؑ کی بیعت بھی اُس طرح اور ان لوگوں نے نہ کی تھی جس طرح اور جن لوگوں نے علیؑ کی بیعت کی تھی۔ نیز حسنؑ سے عداوت میں اور بھی اضافہ ہو چکا تھا کیونکہ جمل وصفّین اور نہروان کے مقتولین کے ورثہ اپنے مورثین کے قاتل (علیؑ) کے فرزند سے بدلہ لینا یا ان کی مخالفت کرنا یا کم ازکم ان کی موافقت نہ کرنا اپنی میراث ہی جانتے تھے۔ اِلّا مَا شَاءَ اللہ

صلح صفّین کے متعلق احسان اللہ صاحب عبّاسی کی رائے

امیر المومنینؑ کے متعلق احسان اللہ صاحب عبّاسی اپنی تاریخ اسلام میں جو رائے

لکھتے ہیں وہ بعینہ نقل کی جاتی ہے اور محبّانِ علیؑ سے امید ہے کہ باوجود ادعائے محبت واقعات سے بے بہرہ رہ کر امیر المومنینؑ کے خلاف رائے قائم کرنے میں تعجیل سے کام نہ لیں گے۔ اس لیے کہ وہ تو علیؑ کو معصوم اور خطاؤں سے پاک سمجھتے ہیں اور یہ رائے ایسے شخص کی ہے جو علیؑ کو غلطی کر سکنے والا انسان خیال کرتا ہے (اس کی تائید تاریخ اسلام مولفہ عباسی صاحب میں ملتی ہے) احسان اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"معاویہ کے ساتھیوں کو مکر کرنے، جھوٹ بولنے اور مسلمانوں کا خون ناحق بہانے میں کوئی تامل نہ تھا اور یہاں علیؑ بن ابی طالبؑ کو بڑی دقت یہ تھی کہ وہ خود کو احکام شرعی کا پابند رکھتے تھے۔ شروع میں وہ تلوار سے کام نہ لیتے تھے۔ تلوار جب اُٹھاتے تھے کہ معاملہ اختیار سے باہر ہو جاتا تھا اور اس پر بھی ایک دقّت یہ تھی کہ ان کے ساتھی بھی کبھی کبھی مسلمانوں کے مقابلہ میں تلوار اُٹھانے سے رُک جاتے تھے اور ممکن ہے کہ معاویہ کے گروہ میں بھی ایسے لوگ ہوں جو حضرت عثمان کے قتل ناحق سے متاثر ہو کر نیک نیتی سے شیعیان علیؑ کے مخالف بنے ہوں۔ غرض کہ علیؑ کی حالت اپنی خلافت کے زمانہ میں عجب کشمکش میں تھی اور میرے نزدیک رسول اللہ کے صحابیوں سے کسی نے بھی حضرت علیؑ کی سی روحانی تکلیف نہیں اٹھائی۔ لوگ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے واقعہ کو نہایت سخت سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی حالت کشمکش زیادہ تر ہمدردی کے لائق ہیں۔ اگر واقعہ کربلا کو طاعون سے نسبت دیں تو علیؑ کے دقتوں کو عارضہ ضیق النفس

سے تشبیہ دے سکتے ہیں (ص ۱۹۸) مطبوعہ ۱۸۹۵ء۔ بعض کج رائے مورخوں کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ کی خود رائی ناکامی کا سبب ہوئی، لیکن حضرت علیؑ پر خود رائی کا الزام غلط ہے۔ علم، شجاعت، متانت اور حکمت ان کے حصہ میں تھی خود رائی چہ معنی دارد، خود رائی نہیں بلکہ وہ حالات ان کی ناکامیوں کے سبب ہوئے جن کا خلاصہ اوپر بیان کیا گیا۔"

محاضرات راغب اصفہانی میں ہے کہ:

"معاویہ کو حضرت علیؑ پر محض اس وجہ سے غلبہ حاصل ہو گیا کہ معاویہ ہر حیلہ سے اپنا کام نکالتے تھے، چاہے حلال ہو یا حرام۔ بات یہ ہے کہ معاویہ کو دین کی پروا نہ تھی اور نہ خدا کا خوف تھا اور حضرت علیؑ کسی حیلۂ ناجائز کو کبھی کام میں نہ لائے۔"

علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں:

"ابو قیس ازدی سے مروی ہے کہ میں نے لوگوں کو تین طرح کا پایا۔ ایک اہلِ دین جو حضرت علیؑ کو دوست رکھتے تھے۔ دوسرے اہلِ دنیا جو معاویہ کو چاہتے تھے۔ تیسرے خوارج۔"

رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب مرحوم بالقابہ اپنی تاریخ (۹) A Short History of the Sarcens۔ (اے شارٹ ہسٹری آف دی سرسنس) کے ص ۷۱ پر لکھتے ہیں:

"معاویہ کے چال چلن اور ان کیفیات کا خلاصہ جنھوں نے معاویہ کی جیت کو یقینی بنا دیا۔ ایک انگریز اہلِ قلم نے جس کے خیالات کم از کم

اس معاملہ میں تعصب کے نہیں ہو سکتے اس طرح بیان کیے ہیں: سیانا، بدنیت اور بے رحم اموی خلفاء میں کا یہ پہلا خلیفہ کسی گناہ سے جو اس کے مطلب حاصل کرنے میں ضروری ہو نہ جھجکتا تھا اپنے ایسے مخالف کو جس سے اس کو خطرہ ہو راہ صاف کرنے کے لیے اس کو قتل کر دینا اس کی عادت تھی۔ پیغمبرؐ کے نواسہ کو اُس نے زہر دلوا دیا۔ علیؑ کے بہادر لفٹیننٹ مالک اشتر کو اسی طرح ہلاک کرا دیا گیا۔ اپنے بیٹے یزید کی خلافت جمانے کے لیے معاویہ نے ان وعدوں کی خلاف ورزی میں ذرا تامل نہ کیا جن کا عہد علیؑ کے فرزند حسنؑ سے جو علیؑ کے بعد بچ رہے تھے کر چکا تھا۔"

باوجود اس کے اس مطمئن، پہلے سے تدبیر سوچ رکھنے والے، منکر خدا عرب نے اسلامی مملکت پر خود بھی حکومت کی اور اس کے خاندان کے قبضہ میں حکومت اسلامی کا عصا تقریباً نوے سال رہا۔

امام حسن علیہ السّلام کو امیر المومنین علیہ السّلام کے بعد انہی معاویہ صاحب سے سابقہ پڑا تھا بلکہ اتنا اور اضافہ تھا کہ ہر ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ امام حسنؑ ہو بہو علیؑ اور رسولؐ کی نقل ہیں اور انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے معاویہ کی طاقت اور علانیہ اسلام کشی کی جرأت میں اب ابتدائے بیعت امیر المومنینؑ کے زمانہ سے کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور ان لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو چکی تھی جو کھُلم کھُلا معاویہ اور اس کے اعمال کے طرفدار تھے اور معاویہ کی صحابیت واجتہاد کی عظمت پورے شباب پر ہو گئی تھی امیر المومنین سے بڑھ کر نبی اللہ کہا گیا اور کسی مسلمان کو جرأت نہ تھی کہ ٹوکتا۔ (دیکھو کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۴)، مالِ مُفت دلِ بے رحم داد و دہش

کا بازار اب زیادہ گرم تھا۔ خزانہ، فوج قبضہ میں تھی۔ پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قتلِ عثمان کے بعد جیسا اضطراب و انتشار پھیلا تھا اور جس نے علیؑ کی بیعت پر لوگوں کو مجبور کر دیا تھا اور ایسے ایسے لوگوں کو بھی مجبور کر دیا تھا جو اپنے دل میں تمنائے حکومت وخلافت لیے ہوئے تھے، امام حسنؑ کے وقت میں نہ تو لوگوں میں ویسا اضطراب تھا اور نہ اس طرح کی بیعت ہی ہوئی تھی۔ بلکہ مورّخین کا وہ بیان جو اوپر گذرا، بتلاتا ہے کہ آپ امیر المومنینؑ کی وصیت سے خلیفہ ہوئے۔ طبری وخلدون نے تو اس کو بھی صرف اشاروں میں بیان کیا۔ اِن سب کا خلاصہ یہ نکلا کہ خلافت کے لیے جس بیعت کے لوگ اور جس رنگ کی بیعت کے لوگ عادی ہو چکے تھے وہ بھی مختلف فیہ ہے۔

اب ایک طرف تو معاویہ اور ویسا جیسا اوپر بیان ہوا۔ دوسری طرف وہ رعایا اور فوج جو آپ کی رعایا اور فوج کہلاتی تھی یعنی بہ الفاظ دیگر وہ لوگ جنھوں نے کُھلم کُھلا معاویہ کو خلیفہ نہیں مانا تھا اور امام حسنؑ کی رعیت اس لیے تھے کہ وہ علیؑ کی فوج کے ایسے لوگ تھے جن کا ذکر ابھی ہوا، اور اس طرف امام حسنؑ جو حرف بحرف پابند احکامِ خدا ورسولؐ اور پابند شریعت اور پیروِ رسولؐ وعلیؑ۔

اس طرح امام حسنؑ کی حکومت یا بیعت ہوئی اور جس طرح کے لوگوں نے بیعت کی اس کا اندازہ اور ان بیعت کنندگان کو لے کر جس سے مقابلہ ہے اس کا بیان اوپر گذرا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ امام حسنؑ کے حالات پر نظر ڈالیں اور آپ کی صلح پر غور کریں کہ آپ کو رسولؐ کے دین کی ذمہ داری لیے ہوئے کیا کرنا چاہیئے تھا۔

آپ ۱۵ رمضان ۳ھ بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے۔ رسالت مآبؐ کی

شہادت کے وقت آپ کا سن کچھ اوپر سات سال کا تھا۔ آپ کی حیثیت و حالت عام بچوں کی سی نہ تھی بلکہ بچپن ہی سے خدا اور رسولؐ کی طرف سے خاص امتیاز کے مالک تھے۔ آیت تطہیر کے مصداق واقعہ مباہلہ کا ایک جزء، باوجود کمسن ہونے کے اذا دعوت فامنوا[1] کے مخاطب کسی بچہ سے بیعت نہ لینے کے باوجود رسول خداؐ کا آپ سے بیعت لینا اور آپ کو مخاطب فرمانا وغیرہ بتلاتا ہے کہ آپ کی حیثیت عام بچوں کی سی نہ تھی۔

"ان الحسنؑ بن علیؑ جاء لابی بکر وھو علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال انزل عن مجلس ابی فقال صدقت واللہ انہ لمجلس ابیک ثم اخذہ واجلسہ فی حجرہ وبکی۔"[2]

(ارجح المطالب ص ۲۷۱)

وہ تمام واقعات جو آپ کے نانا کی وفات کے ساتھ ہی اہلبیت پر آن پڑے سب، آپ کے سامنے تھے۔ آپ نے اپنے نانا کی زندگی ہی میں آیندہ واقعات کی بہت کچھ خبریں سُن لی تھیں اور بہت سے احکام سمجھے اور معلوم کر لیے تھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی زندگی کے وہ واقعات جو بعد وفات سرورِ دوجہاںؐ پیش آئے تھے از اوّل تا آخر سب آپ کے پیش نظر تھے۔ اگر امام حسن علیہ السلام کی حالت صرف عام انسانوں کی سی بھی مانی جائے، خاندانی خصوصیات، امامت، عصمت وغیرہ کا لحاظ نہ بھی کیا جائے تب

---

[1] جب میں دعا کروں تم آمین کہنا۔

[2] امام حسنؑ، حضرت ابوبکر جس وقت منبر پر تھے پہونچے فرمایا میرے باپ کی نشست گاہ سے نیچے آؤ۔ ابوبکر نے کہا، سچ کہا، بخدا یہ آپ ہی کے باپ کی جگہ ہے، پھر آپ کو گود میں بٹھایا اور رو دیئے۔

بھی حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آپ کے سات سے نو برس تک کے سن کا ہے، ایسے حوادث اس سن کے بچے اچھی طرح یاد رکھتے ہیں اور رکھ سکتے ہیں۔ پھر عمر صاحب کی خلافت تو سن شعور و شباب میں دیکھی۔ حضرت عثمان کی پوری خلافت بھی پورے تجربہ و عملی زندگی کے زمانہ میں گزری۔ آپ نے عالم کا رنگ ڈھنگ، امیرالمومنینؑ کی بیعت ظاہری اور اس کے آثار خوب اچھی طرح دیکھے اور امن انقلاب، جنگ، صلح کے نقشے پوری طرح آپ کے سامنے رہے۔ مدّعیان اسلام کے کیرکٹر بھی واضح طور سے پیش نظر رہے۔ اگر آپ کی ۱۸ برس کی عمر سے امیرالمومنینؑ کی بیعت عامہ کے زمانہ تک اور آپ کے عہد حکومت تک کا حساب لگایا جائے تو آپ کو مکمل ۲۵ سال اس امر میں گذرے کہ آپ مسلمانوں کے حالات نہایت ہی اتصال کے ساتھ ملاحظہ فرماتے رہے اور اصحاب کا رجحان طبعی اور بیعت کرنے والوں کے میلان فطری کا گہری نظر سے مطالعہ فرماتے رہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی شہادت ۲۱ رمضان سنہ ۴۰ھ میں واقع ہوئی اس وقت امام حسنؑ کی عمر ۳۷ سال کی تھی اور آپ کی بیعت انھیں مدعیان اسلام نے کی تھی جنھوں نے امیرالمومنینؑ کی بیعت کی تھی اور جو مقام نخیلہ سے باوجود سخت تنبیہ، ترغیب، توبیخ، و تحریص کے معاویہ سے جنگ پر آمادہ نہ ہو کر متفرق ہو گئے تھے۔ اب حالات مذکورۂ بالا پر نظر کرتے ہوئے دیکھنا ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی حکمت عملی کیا ہونا چاہیئے تھی۔ آج تو کوتاہ بین کہہ رہے ہیں کہ امام حسنؑ نے صلح کی نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اگر کہیں آپ نے فوج کشی بھی نہ کی ہوتی تو نہ جانے دینا اور کس گمراہ کُن رلئے پر جم جاتی۔ غالبًا اسی دن کے لیے آپ نے باوجود اس کے کہ ان بیعت کرنے

والوں کی خو بُو سے اچھی طرح واقف تھے پھر بھی نادانوں کی زبان بند کرنے اور کوتاہ اندیشوں پر حجت تمام کرنے کی خاطر جنگ کا ارادہ کر لیا اور ظاہری کوئی کمی نہ چھوڑی آپ کی بیعت ہوتے ہی معاویہ نے ۶۰ ہزار فوج لے کر آپ پر حملہ کیا اور مقام مسکن میں آ اترا جو بغداد سے دس فرسخ تکریت کی جانب اوانا کے قریب واقع ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے بھی مقابلہ کے لیے خود فوج کی کمان ہاتھ میں لی اور قیس بن سعد بن عبادہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بارہ ہزار فوج بھیجی جو معاویہ کی پیش قدمی کو روکے اور خود فوج لے کر کوفہ سے ساباط مدائن میں آگئے لیکن چند روز بعد مدائن میں ایک جھوٹی خبر مشہور ہو گئی کہ قیس مارے گئے۔ تاریخ کامل و تاریخ بن واضح سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خبر معاویہ نے مشہور کرائی تھی۔ اس خبر سے امام حسنؑ کی فوج میں بغاوت پھیل گئی، وہی لوگ جو آپ کے ساتھ ہو کر معاویہ کا مقابلہ کرنے کا اظہار کر رہے تھے آپ کے خیمہ پر ٹوٹ پڑے، آپ کا سب مال و متاع لوٹ لیا، آپ کے نیچے سے مصلیٰ تک گھسیٹ لے گئے، اور ردا تک دوش مبارک سے اتار لی۔ مگر ربیعہ اور ہمدان کے بعض بہادروں نے آپ کو بچا لیا اور بعض گمراہوں نے معاویہ سے سازش کر کے اور رشوتیں لے کر ارادہ کر لیا کہ آپ کو گرفتار کر کے معاویہ کے حوالہ کر دیں، اور ان کے بعض رئیسوں نے خفیہ خط و کتابت کر کے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی اور اُسے لکھا کہ بہت جلد عراق چلے آئیے۔ ہم ذمہ لیتے ہیں کہ امام حسنؑ کو پکڑ کر آپ کے حوالہ کر دیں گے (حبیب السیر و ابن اثیر)۔ اس ہنگامہ میں آپ کی ران پر ایک بدبخت نے ایسا وار بھی کیا کہ جس سے ہڈی تک کا گہرا زخم لگا۔ مجبوراً وہاں سے مدائن کے قصر ابیض میں چلے گئے اور اس کے علاج میں مصروف ہوئے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ امام حسنؑ کی بیعت کرنے والے یا آپ کی فوج زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار تھی، اور معاویہ جو فوج میدان میں لایا وہ نوّے ہزار تھی۔ قرآن مجید کی آیت میں جہاد کے لیے دو کے مقابلہ میں ایک کی حد رکھی گئی ہے، اس حساب سے ۸۰ ہزار ہوتے تو ۴۰ ہزار سے لے کر جنگ کی گنجائش ہوتی، ورنہ بحکم قرآن وجوب سے آزادی ہے۔ یہ تو جب ہوتا جب کوئی امام کی سنتا بھی۔ مگر یہاں کا عالم تو وہ تھا کہ جس کے متعلق معلوم ہو کہ ان لوگوں کو ابھی ابھی امیرالمومنینؑ نے ہر چند ابھارا، اُکسایا، ملامت کی، رغبت دلائی مگر وہ معاویہ سے لڑنے پر آمادہ نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔ عبّاسی صاحب تاریخ اسلام ص ۲۰۸ پر لکھتے ہیں (جنگ خوارج کے بعد):

"اب امیرالمومنینؑ نے براہ موصل شام چلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن سردارانِ فوج کی رائے ہوئی کہ ہتھیار خراب ہو گئے ہیں۔ کوفہ چل کر نئے ہتھیار لیے جائیں اور پھر وہاں سے شام کا ارادہ کیا جائے۔ کوفہ میں چل کر سپاہیوں نے ہاتھ پاؤں پھیلا دیے جس سے علیؑ نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ پھر لوگوں نے امیرالمومنین علیؑ سے معذرت کی اور انھوں نے بہ مجبوری معذرت قبول کی، معذرت قبول نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔"

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ معاویہ کے یہاں کسی اصول اسلامی کی پابندی نہ تھی بلکہ جس طرح ہو سکے حصولِ مقصد پیش نظر تھا۔ مگر امیرالمومنینؑ کے یہاں سرمُو احکام شرع سے تجاوز جائز نہ تھا۔ نہ خود تجاوز کرتے نہ تجاوز کرنے والے سے چشم پوشی

کو جائز رکھتے۔ علّامہ عباسی ص ۷۰۹ پر لکھتے ہیں:

"پیغمبر خدا کو مرے ہوئے پچیس برس ہو چکے تھے۔ ان کے فیض صحبت کا اثر طبیعتوں سے زائل[1] ہو چلا تھا۔ جنگ جمل تک کھینچ کھانچ کر نیک نیتی اور غلط فہمی کو کھپایا گیا لیکن اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ اب صاف طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ امیر المومنین علی کرّم اللہ وجہہ نیک نیتی کے قدم بقدم تھے، یعنی دین اور دنیا دونوں کو وہ ساتھ رکھنا چاہتے تھے[2]۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ امت نبوی پر کوئی نااہل حکمراں یا امیر ہو، اور یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ جس کو وہ سب سے اچھا سمجھیں (یعنی اپنی ذات کو) اُسے پولیٹکل معاملات سے الگ رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دین کو دنیا پر مقدّم سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ تلوار بھی اُٹھاتے تو اس لیے کہ بغاوت کا رفع کرنا اور ناسزاؤں کو سزا دینا ضروریات سے تھا، یہ بھلا ہو یا بُرا۔ بس اِس کے سوا اور کوئی فعل وہ ایسا نہ کرتے تھے جو کسی فریق کے نزدیک مذہب کے خلاف یا اخلاقی خوبیوں کے منافی ہوتا۔ مسلمانوں کا دوسرا گروہ ان لوگوں کا مجموعہ تھا جو دنیاوی لذّتوں کو مقدّم سمجھتے تھے اور دنیا زور لا تحصل الا بالتزود[3] پر عمل کرنے میں تامّل نہ کرتے تھے۔ یہ گروہ

---

[1] یہ عبّاسی صاحب کی رائے ہے ورنہ ہم تو صحبت کے فیض سے محرومی کا نقشہ رسول کے عالم احتضار ہی میں دیکھ رہے ہیں۔

[2] بلکہ دین کو ہر وقت ملحوظ اور مقدم رکھنا چاہتے ہیں۔

[3] دنیا سراپا مکر ہے جو بغیر مکّاری ہاتھ نہیں لگتی۔

دیکھا دیکھی بڑھتا گیا اور سُنّت نبوی سے الگ ہو کر شام اور عجم کے سلاطین اور ان کے اراکین کا رنگ پکڑتا گیا۔ معاویہ اس گروہ کا سردار تھا۔ اتفاق زمانہ نے اس کو سردار بنادیا، یا یوں کہیے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا موقع ملا۔"

امیرالمومنینؑ کی شرعی پابندی کی حد اس درجہ بلند تھی کہ بقول شخصے حضرت ابن عباس اور عقیل بن ابی طالب جیسے لوگ بھی برداشت نہ کر سکے اور آپ کا ساتھ دے سکے۔ امام حسنؑ کی پالیسی بلکہ جیسا کہ بار بار کہا جاچکا ہے کل اہلبیتؑ کی پالیسی ایک اور صرف ایک تھی۔ (ملاحظہ ہو دراساۃ اللبیب ص ۹۴ بطبع لاہور ۱۲۸۴ھ) وہ یہ کہ حکم خدا اور حکم رسولؐ کی پابندی انھیں کے احکام کا اجرا چاہے اس مطلب کے لیے جو برداشت کرنا پڑے۔ مذکورۂ بالا حالات میں امام حسن علیہ السلام کے لیے سوائے صلح کیا چارہ ہوسکتا تھا اس کو خود صاحبانِ عقل سمجھ سکتے ہیں کسی استدلال کی چنداں ضرورت نہیں۔

یہاں پر علامہ ابن اثیر کی یہ عبارت جو اپنی تاریخ کامل میں لکھتے ہیں قابلِ غور ہے:

"کہا گیا ہے کہ امام حسنؑ نے حکومت معاویہ کو اس لیے سپرد کی کہ جب معاویہ نے خلافت حوالہ کرنے کے متعلق آپ کو خط لکھا اس وقت آپ نے خطبہ پڑھا اور خدا کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ دیکھو ہم کو شام والوں سے اس لیے نہیں دبنا پڑ رہا ہے کہ (اپنی حقیقت میں) ہم کو کوئی شک یا ندامت ہے۔ بات تو فقط یہ ہے کہ ہم اہلِ شام سے سلامت وصبر کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ مگر اب سلامت میں عداوت اور صبر میں فریاد مخلوط کر دی گئی جب تم لوگ صفین کو جا رہے تھے اس وقت تمھارا دین تمھاری دنیا پر مقدم تھا لیکن اب تم ایسے

ہوگئے ہو کہ آج تمھاری دنیا تمھارے دین پر مقدم ہوگئی ہے۔ اس وقت تمھارے دونوں طرف دو قسم کے مقتول ہیں، ایک صفین کے مقتولین جن پر رو رہے ہو، دوسرے نہروان کے مقتول جن کے خون کا بدلہ چاہ رہے ہو۔ خلاصہ یہ کہ جو باقی ہے وہ ساتھ چھوڑنے والا ہے، اور جو رو رہا ہے وہ تو بدلہ لینا چاہتا ہی ہے۔ خوب سمجھ لو کہ معاویہ نے ہم کو جس امر کی دعوت دی ہے نہ اس میں عزت ہے نہ انصاف۔ لہٰذا اگر تم لوگ موت پر آمادہ ہو تو ہم اس کی دعوت کو رد کر دیں اور ہمارا اس کا فیصلہ خدا کے نزدیک بھی تلوار کی باڑھ سے ہو جائے، اور اگر تم زندگی چاہتے ہو تو جو اُس نے لکھا ہے مان لیا جائے اور جو تمھاری مرضی ہے ویسا ہو جائے۔ یہ سُننا تھا کہ ہر طرف سے لوگوں نے چلّانا شروع کیا، بقا، بقا۔ صلح، صلح۔"

(کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۲)

ناظرین انصاف فرمائیں کہ کیا اب بھی امام حسن علیہ السلام کے لیے یہ رائے ہے کہ صلح نہ کریں، ان فوجیوں کے بل بوتے پر (اگر ایسوں کو فوج یا ان کی قوتوں کو بل بوتا کہا جا سکے) لڑائی زیبا ہے، ہرگز نہیں! ۔ ایسے حالات میں صرف یہی چارہ تھا کہ صلح کر کے اپنی اور ان تمام لوگوں کی زندگی کو محفوظ رکھیں جو دینِ رسولؐ کے نام لیوا اور حقیقی پیرو و پابند تھے جن کو حفظ اصول نہایت درجہ عزیز تھا اور جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی بجائے اس کے کہ ان نام نہاد بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر معاویہ کے قیدی بن کر قتل ہو جائیں اور اس طرح وہ تعلیم اور دین جس کے علمبردار اہلبیتؑ تھے ان شہدا سمیت دفن ہو جائے یا صلح سے کام لیں اور اپنے اور خالص

ایمان داروں کے لیے میدان صاف کرلیں۔ روحانی اذیّتیں برداشت کریں، سخت سے سخت اہانت آمیز فقرے، جملے سُنیں، خونِ دل پئیں اور اس لیے زندہ رہیں کہ دینِ رسولؐ جو معاویہ و طرف دارانِ معاویہ کے یہاں ذبح کیا جارہا تھا زندہ بچ جائے اور شائع ہوجائے کہ اصل تعلیم و دینِ رسول کیا ہے اور فریبِ معاویہ کا پردہ چاک ہوجائے۔ غیر جانب دار تو غیر جانب دار خود معاویہ اور اُس کے ہمنواؤں پر بھی روشن ہوجائے (چاہے وہ خود غرض زبان سے اقرار نہ بھی کریں) کہ پیغمبرِ اسلامؐ کیا لے کر آئے تھے اور وہ کس قول و عمل کے خواہاں تھے اور اس تعلیم کا حافظ، محافظ، عالم اور عامل کون اور کدھر ہے اور اس کا مخالف کون اور کدھر ہے۔ زمانہ صلح اتنا رکھ لیا جائے کہ اس آواز کو اتنی دور تک اور اس انداز سے محکم کرلیا جائے کہ آیندہ اگر معاویہ سے بڑھ چڑھ کر بھی کوئی اسلام کو فنا کرنے کے لیے کھیل کھیلے اور علی الاعلان دینِ رسولؐ کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں منہمک ہوجائے تب بھی اس کے بس سے یہ امر باہر رہ جائے اور اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔ یوں ایمان خالص اور وہ تعلیم رسولؐ جس کے قائل و عامل اہلبیتؑ ہیں اس کے پابندوں کی ایسی تعداد پیدا ہوجائے جسے لے کر اگر کوئی صاحبِ ایمان، مخالفین کے سامنے کھڑا ہوجائے تو مرتے دم تک وہ اپنے واجب الاطاعت اور صاحبِ ایمان سردار کا ساتھ نہ چھوڑے بلکہ پروانہ وار خود جل مرے مگر اپنی زندگی تک اس شمعِ ایمان کو گُل نہ ہونے دے۔

امام حسن علیہ السلام کے پیشِ نظر یہ مقصد برابر تھا کہ آنے والے ذبحِ عظیم کو کامیابی کے مواد دیے جائیں چاہے اس کے واسطے موت سے بدتر روحانی اذیّتیں سہنا پڑیں۔ لیکن یہ مقصد امام حسنؑ کے اس طرح جان دے دینے میں جو معاویہ سے

صلح نہ کرکے ہوئی ہرگز حاصل نہ ہوتا۔ امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد اور ان لوگوں کی ظاہراً بیعت کا مقتضی تھا کہ آپ بھی بیعت نہ کرنے والوں یا خلیفۂ برحق سے جنگ اور مخالفت کرنے والوں پر فوج کشی کریں، وہ کی گئی۔ لیکن جو کچھ اس فوج نے کر دکھایا وہ ظاہر ہے جس کا بیان اوپر گذرا۔ اب امام حسنؑ کے لیے دو ہی صورتیں ممکن نظر آتی ہیں یا صلح کرنا یا بے یار و مددگار جنگ کو جاری رکھنا، اور پھر جس صورت سے ہو جان بحق ہو جانا۔ جن لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور امام حسنؑ کی صلح کا صرف سرسری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ دھوکے میں ہیں۔ اِدھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ اُدھر ان کے دونوں مخالف معاویہ و یزید۔ پھر دونوں کے وقت اور حالات میں امتیاز بغیر فیصلہ کر دیتے ہیں کہ امام حسنؑ کو بھی وہی کرنا چاہیئے تھا جو امام حسینؑ نے کیا۔ حالانکہ ایک شہزادہ نے اپنے وقت اور حالات میں جو کچھ کیا یقیناً دوسرا شہزادہ بھی وہی کرتا اگر اس کے وقت و حالات ویسے ہی ہوتے جیسے ایک کے تھے۔ اگر حسینؑ کی فوج کے سرداروں میں اشعث ایسے لوگ ہوتے اور آپ کو بھی معاویہ جیسے شخص سے لڑنا پڑتا جو عمّار کو قتل بھی کرتا پھر اس سے دامن کشی بھی جو حجر بن عدی کو قتل بھی کرتا، پھر نماز جنازہ و تجہیز و تکفین بھی تو امام حسینؑ بھی ایسا ہی کرتے جو حسنؑ نے کیا بلکہ امام حسینؑ نے بمقابلہ معاویہ وہی کیا جو حسنؑ نے کیا۔ (دیکھو واقعات سنہ ۵۰ھ تا سنہ ۶۰ھ جب امام حسینؑ زندہ تھے اور معاویہ کا دَور تھا) اور اگر امام حسنؑ کو بھی وہ انصار ملتے جنھیں ہر ہر طرح ساتھ چھوڑنے کا موقع دیا گیا۔ مگر انھوں نے حسینؑ کے قدموں پر فدا ہونے کو دنیا و آخرت کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ سمجھا۔ حبیب و مسلم جیسے جاں نثار دستیاب ہو گئے ہوتے اور آپ کو بھی یزید سے لڑنا

پڑتا جو بیعت یا قتل کے سوا کسی دوسرے امر کو جائز نہ رکھتا جو مسلمان مقتولین کے دفن کی اجازت نہ دیتا جو،

لعبت ھاشم بالملک فلا
ملک جاء ولا وحی نزل[1]

کا علانیہ قائل ہوتا تو امام حسنؑ بھی وہی کرتے جو امام حسین علیہ السلام نے کیا۔

اب ہم امام حسنؑ کی صلح کے متعلق بعض اہلسنت کی کتابوں کی عبارتیں نقل کرتے ہیں، پھر انشاء اللہ نتیجہ پر بحث کریں گے۔

شیخ محمد صبان اپنی کتاب اسعاف الرّاغبین مطبوع مصر برحاشیہ نور الابصار ص ۱۴۷ مطبع دار احیاء الکتب العربیہ ۱۳۴۵ھ پر لکھتے ہیں:

"حسن بصری کی جو روایت بخاری میں ہے وہ یہ ہے کہ امام حسنؑ نے معاویہ کے مقابلہ میں پہاڑ کی طرح فوج لا کھڑی کی۔ اس وقت عمرو عاص نے معاویہ سے کہا کہ میں ایسا لشکر دیکھ رہا ہوں جب تلک اس کے سب سرگروہ قتل نہ ہو جائیں ہٹنے والی نہیں۔ تب معاویہ نے جو خدا کی قسم ان دونوں میں سے بہتر آدمی تھا کہا کہ اے عمرو! اگر ان لوگوں نے ان کو اور ان لوگوں نے اِن کو قتل کر ڈالا تو پھر میں مسلمانوں کا انتظام کن کے ذریعہ کروں گا، ان کے رشتہ داروں اور ان کے اموال کا نظم و نسق کن سے کراؤں گا۔ یہ کہہ کر اس نے قریش کے قبیلہ بنی عبد شمس

---

[1] آلِ ہاشم (یعنی نبی کریمؐ) نے ملک گیری کا کھیل کھیلا، نہ کوئی فرشتہ آیا نہ ان پر وحی ہوئی۔

کے دو آدمی یعنی عبدالرحمٰن بن سمرہ اور عبدالرحمٰن بن عامر کو امام حسنؑ کے پاس بھیجا اور کہا کہ تم دونوں اس شخص (امام حسنؑ) کے پاس جاؤ اور صلح پیش کرو، ان سے کہو سنو اور ان سے اس کی خواہش کرو۔ یہ دونوں آپ کے پاس آئے، باتیں کیں اور یہ کہا کہ معاویہ آپ کے سامنے یہ یہ باتیں پیش کرتا ہے اور آپ سے یہ چاہتا ہے اور اس کا یہ سوال ہے۔ امامؑ نے کہا کہ میرے پاس اس کا ضامن کون ہے؟۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم اس کے ضامن ہیں۔ اب امام حسنؑ ان دونوں سے جو جو مطالبہ کرتے گئے یہ دونوں اُس کا ذمہ لیتے گئے۔ اس طرح امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کی۔"

اس عبارت کے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"دولابی نے روایت کی ہے کہ امام حسن (علیہ السلام) نے فرمایا کہ عرب کے سر ہمارے قبضہ میں تھے (جب واقعی حق دار ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری بیعت اور خلیفہ سابق کی طرف سے تعیین و تنصیص ہو چکی) جس سے ہم صلح کرتے ان کو صلح کرنا پڑتی اور جس سے ہم جنگ کرتے انھیں جنگ کرنا پڑتی لیکن ہم نے خدا کی مرضی کے لیے اور مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے جنگ کو ترک کیا، اپنی حکومت ۴۱ھ ماہ ربیع الاول اور بقولے جمادی الاولیٰ میں ترک کی اس پر ان کے اصحاب ان سے یا عار المومنین کہہ کر خطاب کرتے، آپ ان کے جواب میں یہ فرماتے کہ العار خیر من دخول النار (جہنم میں جانے سے عار اختیار کرنا بہتر ہے) اس کے بعد آپ کوفہ سے مدینہ چلے گئے اور وہیں اقامت فرمائی۔ (اس کے بعد یہ برابر ہوتا رہا کہ)

وہاں کا حاکم امام حسنؑ اور ان کے والد (علیہما السلام) کو بر سر منبر اور دوسرے حالات میں بھی سب دشتم کرتا رہا، اور آپ کو ایسی ایذا دیتا رہا جس کی اذیّت سے موت کی اذیّت کم ہے۔ لیکن آپ نے محض خدا کی خوشنودی کے لیے صبر فرمایا اور چونکہ آپ نے حکومت (یا خلافت ظاہری) محض خدا کی خوشنودی کے لیے ترک کی۔ لہٰذا خداوند عالم نے آپ کو آپ کے اہلبیتؑ کو اس کے عوض میں خلافت باطنی عطا فرمائی۔ یہاں تک کہ ایک قوم تو اس کی قائل ہے کہ اہلبیتؑ کے سوا کبھی قطب الاولیاء کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

یہ دونوں عبارتیں بعینہا صواعق محرقہ ص ۸۱ مطبوعہ میمینہ مصر پر بھی موجود ہیں۔ ان دونوں عبارتوں سے امور ذیل واضح طور پر ثابت ہیں:

۱۔ صلح کی گفتگو کا پیغام امام حسنؑ کے پاس معاویہ نے بھیجا، امام حسنؑ نے ابتدا نہیں فرمائی۔

۲۔ امام حسنؑ نے صلح قبول کرنے کے لیے دونوں آنے والے ایلچیوں سے عہد و میثاق لیا۔

۳۔ صلح کے بعد جو اذیّت آپ کو دی جاتی رہی اس سے موت کی اذیّت کم تھی۔

۴۔ اذیّت دینے والا امیر معاویہ کی طرف کا حاکم تھا، اور یہ واقعات خاص امام حسنؑ کے نانا رسول اللہؐ کے مدینہ میں اور ان لوگوں کے سامنے ہوتے تھے جو وہاں کے باشندے تھے۔

۵۔ شرائط صلح میں جیسا کہ ذکر ہوگا سب نہ کرنا بھی تھا، مگر اس کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی۔

۶۔ جو لوگ امام حسنؑ کے اصحاب کہلاتے تھے ان کو امام حسنؑ کے فعل پر اتنا بھی اعتماد نہ تھا جتنا عام دوستوں کے فعل پر عام احباب کا ہوتا ہے ورنہ وہ عارالمومنین نہ کہتے اور ان کو اتنی بھی محبت نہ تھی کہ کم از کم اُن کے منھ پر اُن کے فعل کی مذمت نہ کرتے اور باوجود امام حسنؑ کے سمجھانے کے اپنی اس حرکت کو برابر جاری رکھتے، اور دوسرے لوگ بھی اس کو نہ ٹوکتے اور باوجود فوج کی نالائقی بلکہ فوج کے اصرار پر صلح کی گئی پھر بھی عارالمومنین کہا۔

۷۔ معاویہ نے بیان کیا کہ اتنے مسلمانوں کے مرنے سے اس درجہ ابتری پھیلے گی کہ مسلمانوں کے امور ناموس اور جائدادوں کی خبر گیری کرنے والے تک نہ رہیں گے۔

۸۔ شرائط صلح کی ایسی مخالفت کے باوجود بھی اکثر مسلمانوں نے معاویہ کا ساتھ نہ چھوڑا نہ معاویہ سے جنگ کی نہ اس کو نااہل کہا۔

۹۔ امام حسن علیہ السلام جنگ کرنے کو (علی الخصوص محض لوگوں کے مزعومہ عار سے بچنے کے لیے) اس وقت اس درجہ بدتر سمجھتے تھے کہ گویا جنگ کرنا خودکشی تھی (جس کی سزا میں نار کا وعدہ ہے) ورنہ العار خیر من دخول النار کا کوئی مطلب نہیں۔ یہ تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ امام حسنؑ معاویہ کو حق پر سمجھتے تھے اس لیے اس سے لڑنا معاذ اللہ نار کا سبب تھا اس لیے کہ امام حسنؑ نے قبل و بعد وقت صلح معاویہ کا باطل پر ہونا خوب اچھی طرح واضح کر دیا تھا، ورنہ فوج کشی

چہ معنی دارد۔ اور دوسری طرف تمام اہلِ اسلام کا اجماع کہ امام حسنؑ بعد امیرالمومنینؑ خواہ بہ بیعت خواہ بہ وصیت امام اور خلیفہ ہو چکے تھے۔

۱۰۔ امام حسنؑ اور معاویہ میں مصالحت ہوئی۔ اور صلح کرنے کا مطلب طرف مقابل کی ہمیشہ حقیت تو ہو ہی نہیں سکتی، ورنہ رسولؐ کی صلح حدیبیہ پر معاذاللہ حرف آتا ہے۔ بہر حال لفظ صالح قابل فراموشی نہیں ہو سکتی اگر امام برحق سمجھ کر بیعت ہوتی تو عہود مواثیق یہ کرنا ہوگا یہ نہ کرنا ہوگا وغیرہ۔ یعنی چہ خلاصہ یہ کہ یہ صلح تھی اس کو بیعت امامت سمجھنا غلط ہے۔

۱۱۔ صلح کی مصلحت جو امام حسنؑ نے ظاہر کی ہے وہ دو ہے، خدا کی خوشنودی اور مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت۔ گویا صلح نہ کرنا اس وقت ایسا تھا کہ ایک تو خدا ناراض ہوتا۔ دوسرے صرف آپ کا خون بہہ کر نہ رہ جاتا بلکہ مسلمین (کون کون اور کیسے کیسے یہ مجمل ہے) کا خون عبث بہتا جس کو بچانا اہم تھا۔

۱۲۔ امام حسنؑ کا یہ فعل خدا کو اتنا پسند ہوا کہ انعام میں قطب اولیا ہمیشہ کے لیے اہلبیتؑ میں سے معین ہو گیا، اور بقول علامہ ابن ابی الحدید مرتبۂ ولایت مرتبۂ خلافت سے کہیں بلند ہے۔ اس آخری نتیجہ سے اس کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز معاویہ کے حوالہ تھی وہ کیا اور کس حیثیت کی تھی اور امام حسنؑ کے پاس اس چیز کے چلے جانے پر بھی جو چیز رہی اور آپ کے خاندان کی غلام بن کر رہی۔ وہ کیا۔ اور کتنی قیمتی تھی۔ اور وہ قابلِ نزاع و تحویل ہو بھی سکتی تھی یا نہیں۔ یعنی باطنی خلافت اور قطب الاولیاء کی منزلت۔

اسعاف الراغبین کی عبارت کے بعد اب ہم امام حسنؑ کی صلح اور مفصل شرائط

صلح کے لیے دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو متفرق کتابوں میں متفرق طور پر ملتے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ معاویہ مسلمانوں پر بموجب کتاب اللہ اور سیرت خلفاء صالحین کے حکومت کرے گا۔

۲۔ بیت المال کوفہ میں جو پچاس لاکھ درہم ہیں وہ امام حسنؑ کو دیے جائیں تاکہ وہ اپنا قرضہ ادا کریں۔

۳۔ فسا اور دارالجبرد کا خراج امام حسنؑ کو ملتا رہے گا کہ اہلبیتؑ کے صرف میں آتا رہے۔

۴۔ اب سے حضرت علیؑ پر سب وشتم نہ کیا جائے گا۔

۵۔ معاویہ کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ اپنا کوئی ولی عہد مقرر کرے بلکہ شوریٰ کے رو سے اس کے بعد مسلمانوں کا حاکم مقرر ہوگا اور بہ روایت اوکلی حیوٰۃ الحیوان طبری، ابن قتیبہ اور اعثم کوفی یہ شرط اس طرح تھی کہ معاویہ کے بعد امام حسنؑ خلیفہ ہوں گے، اور اگر ان کا انتقال ہوجائے تو امام حسینؑ۔

۶۔ زمین خدا پر شام، مصر، عراق، حجاز، یمن وغیرہ میں سب جگہ لوگ جان و مال سے امن و امان میں رہیں گے۔

۷۔ اصحاب علیؑ اور شیعیان علیؑ کی جان و مال، عورتیں اور اولاد، سب مامون و محفوظ رہیں گے۔

۸۔ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور اہلبیتؑ میں سے کسی شخص کے حق میں کہیں خفیہ یا علانیہ معاویہ تعریض یا بدی نہیں کرے گا۔ سب محفوظ رہیں گے،

اُنھیں کسی طرح کا خوف نہیں دلایا جائے گا۔

۹۔ معاویہ اس عہدنامہ پر خدا سے عہد میثاق کرے اور اُسے پورا کرے۔
(صواعق محرقہ و حبیب السیر، تاریخ اسلام ص ۲۷ جلد اوّل)

تاریخیں علی العموم اذان دے رہی ہیں کہ امام حسنؑ کی فوج میں نفاق کا بازار گرم تھا۔ اوپر ذکر ہو چکا کہ فوج میں ایسے رشوت خور اور نمک حرام بھی تھے جو امام حسنؑ کو پکڑ کر معاویہ کے حوالہ کر دینا چاہتے تھے، روضۃ الصفاج ۳ ص ۸ ۵۳ میں بعضے از لشکریان کہ مذہب خوارج داشتند کی تصریح ہے۔ پھر ایسی فوج کو لے کر جنگ کرنا مقتضائے دانشمندی ہے یا صلح کر لینا۔ (اور صلح بھی وہ جس میں مشن یعنی تعلیمات رسولؐ کی پوری پوری حد بندی اور استحفاظ کا انتظام کر لیا گیا ہو اور جانب مخالف کی بددیانتی اور کتاب وسُنّت کی خلاف ورزی کا راز بھی منکشف ہو رہا ہو) یہ امر کسی صاحب عقل سے تو پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ رہی زری ضد تو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم کسی عاقل کے لیے بے سمجھے بوجھے جان دینے کو اچھا نہیں کہہ سکتے ہیں تو امام حسنؑ کے لیے کیسے تجویز کر سکتے ہیں۔ ابن خلدون کا ترجمہ جلد چہارم ص ۴۰۶ ملاحظہ ہو:

"شور و غل فرو ہونے کے بعد امام حسنؑ نے لوگوں کی خود رائی اور نفاق کی وجہ سے امیر معاویہ کو لکھ بھیجا کہ میں خلافت و حکومت سے دست کش ہوا چاہتا ہوں۔"

جو لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ جس طرح امام حسینؑ لڑ گئے امام حسنؑ بھی کیوں نہیں لڑ گئے، وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں دونوں شہزادوں کے اصحاب و انصار میں جن کو لے کر لڑائی کی جاتی ہے زمین و آسمان سے بھی تو زیادہ کا فرق ہے۔ کیا یہ مخفی ہے

کو مظلوم کربلا نے اپنے اصحاب کے حق میں انی لا اعلم اصحابا اوفی ولا خیرا من اصحابی[1] فرمایا ہے اور دنیا کی زبانیں حسینی قافلہ کی وفاداری کی ثناخوانی میں متفقہ لطف اندوز ہیں، اور حسنؑ کے ساتھ کہلانے والے نفاق، غداری، نمک حرامی، بیوفائی میں ضرب المثل۔ پھر دونوں کی تکلیف کو متحد کہنا عقل وانصاف کی گردن کو کُند چھُری سے ریتنا نہیں تو اور کیا ہے۔ صاحب روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ چوں آنجناب (امام حسنؑ) جُبن وضعف اصحاب مشاہدہ نمودہ۔ بھلا کیا خالکم بدہن، حسینؑ والوں میں کسی کی طرف کوئی ایسی بات منسوب ہو سکتی ہے؟ العیاذ باللہ۔ ان حالات میں اگر امام حسنؑ لڑتے ہی رہتے اور دشمن کے حوالے کر دیے جاتے تو یا آپ کو تنہا چھوڑ کر فوج بھاگ گئی ہوتی، تو ایسی صورت میں بحیثیت جنرل آپ کو کیا کہتے۔ افسر فوج کا سلیقہ تو اسی میں معلوم ہوتا ہے کہ فوج کی لیاقت کا اندازہ کر کے اقدام کرے اور اصل مقصد میں کامیاب رہے، جب بچے کھچے حالات جو اس وقت تاریخ میں رہ گئے ہیں فوجیوں کی شجاعت و وفا کا کچا چٹھا کھول رہے ہیں تو جس کی آنکھوں کے سامنے واقعات گذر رہے تھے وہ کیا کچھ نہ دیکھ رہا ہوگا۔

جب خود غرض انسان کی خواہش کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو پھر اس کے عقلی جواز و استحسان سے قطعاً آنکھیں بند کر کے نئی نئی کھونچیں نکالا کرتا ہے۔ چنانچہ صلح حسن کے متعلق بھی یہ فیصلہ زیر بحث ہو گیا ہے کہ صلح کی گفتگو شروع کدھر سے ہوئی؟ اس پر بحث کرنے سے چنداں فائدہ نہیں۔ اگر اس صلح کو صحیح مان لیا جائے

---

[1] میں اپنے اصحاب سے بڑھ کر وفادار اور بہتر کسی کے اصحاب کو نہیں سمجھتا اور جانتا۔

اور اگر صلح غلط ہو تو چاہے کوئی ابتدا کرے نتیجہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ بھی معرض گفتگو میں آ گیا ہے۔

علامہ صبان کی منقولہ بالا عبارت سے جو بخاری سے نقل کی گئی ہے ثابت ہے کہ مصالحت کا پیغام پہلے معاویہ نے بھیجا تھا۔ ابن خلدون کی عبارت سے صاف پتہ نہیں چلتا کہ معاویہ نے لکھ بھیجا تو ابتداءً تھا یا جواباً۔ لیکن سیاق سے ظاہر یہی ہے کہ ابتداءً ہو۔ علامہ صبان نے تصریح کر دی ہے کہ دونوں قولوں میں جمع اس طرح ممکن ہے کہ ابتدا معاویہ کی طرف سے ہو پھر امام حسنؑ نے لکھا ہو۔ ترجمہ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۰،۴ پر یہ عبارت واضح دلیل ہے کہ ابتدا معاویہ کی طرف سے ہوئی تھی۔

آپ نے اہل عراق کو مجتمع کر کے خطبہ دیا جس میں بعد حمد و درود کے بیان فرمایا "یا اھل العراق سخی نفسی عنکم ثلاث، قتل ابی وطعنی وانتھاب بیتی[1]۔" پھر فرمایا "الا وقد اصبحتم بین قتیلین قتیل بصفین تبکون لہ وقتیل بالنھروان تطلبون بثارہ واما الباقی فخاذل واما الباکی فثائر وا ان معاویۃ دعانا الی امر لیس فیہ عز ونصفۃ فان اردتم الموت رددناہ علیہ وحاکمناہ الی اللہ بظبا السیوف وان اردتم الحیٰوۃ قبلنا واخذنا لکم الرضا[2]۔" لوگوں نے یہ سن کر ہر طرف سے چلا کر

---

[1] عراق والو! تین باتوں نے مجھے اس صلح کی قربانی پر مجبور کیا، ایک پدر بزرگوار کی شہادت دوسرے نشانہ طعن بننے اور گھر کے لٹنے پر۔

[2] اس وقت تمہارے دونوں طرف دو قسم کے مقتول ہیں، ایک صفین کے مقتول جن پر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہا صلح قائم رکھئے، صلح قائم رکھئے۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ:

۱۔ امیر معاویہ نے صلح کا پیغام دیا۔

۲۔ امام حسنؑ اس صلح کو انصاف اور عزت نہیں مانتے تھے صرف الضرورات تبیح المحظورات کی حد تھی۔

۳۔ امام حسنؑ نے فوج سے مشورہ کیا اور اپنے ارادۂ جنگ کی تصریح کی۔

۴۔ فوج لڑنے پر آمادہ نہ تھی۔

۵۔ جب قوم نے صلح صلح کی چیخ پکار کی تب آپ کو صلح قبول کرنا پڑی۔

تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ، پہلے خط معاویہ ہی نے روانہ کیا تھا۔ ابن اثیر کی عبارت کا مطلب ہے کہ جب معاویہ کے پاس امام حسنؑ کا خط پہونچا تو اُسے روک رکھا۔ اس سے قبل عبداللہ وغیرہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

رو رہے ہو، دوسرے نہروان جن کے خون کا بدلہ چاہ رہے ہو۔ خلاصہ یہ کہ جو باقی ہے وہ ساتھ چھوڑ رہا ہے، اور جو رو رہا ہے وہ تو بدلہ لیا ہی چاہتا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ معاویہ نے ہم کو جس امر کی دعوت دی ہے نہ تو اس میں عزت ہے نہ انصاف۔ لہٰذا اگر تم لوگ موت پر آمادہ ہو تو ہم اس کی دعوت کو رد کر دیں اور ہمارا اس کا فیصلہ خدا کے نزدیک تلوار کی باڑھ سے ہو جائے، اور اگر تم زندگی چاہتے ہو تو جو اس نے لکھا ہے مان لیا جائے اور جو تمھاری مرضی ہے ویسا ہو جائے۔

کو معاویہ، حسن علیہ السلام کے پاس روانہ کر چکا تھا۔

بہرحال چاہے کسی طرف سے ابتدا ہوئی ہو، صلح ہوئی اور (جو غلط فہمی آج اضطراب کا باعث ہے یعنی صلح کا مطلب یہ کہ معاذ اللہ امام حسنؑ نے معاویہ کو حق پر مان لیا یا معاویہ حق پر ہو گیا)۔ امام حسنؑ نے اس اشتباہ کا موقع بالکل باقی نہ رکھا، صلح کے بعد جو خطبہ بیان فرمایا اس میں اس امر کی تصریح کر دی کہ معاویہ حق پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک فتنہ ہے۔ اس فتنہ سے بچنے اور مسلمانوں کے خون کی حفاظت کے لیے صلح قبول کی گئی ہے۔

ترجمہ ابن خلدون ج ۴ ص ۸۰۴ کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

امام حسنؑ نے کھڑے ہو کر بعد حمد و درود کے کہا:

"ایھا الناس ان اللہ ھداکم باولنا وحقن دمائکم باخرنا وان لھذا الامر مدۃ والدنیا دول واللہ عزّ وجلّ یقول لنبیّہ وان ادری لعلہ فتنۃ لکم ومتاع الیٰ حین[1]"

جب اس فقرہ پر پہونچے تو امیر معاویہ نے آپ کو بٹھا لیا۔ کیونکہ انھوں نے ان کے خلاف بیان فرمایا۔

---

[1] لوگو! ہمارے اول سے اللہ نے تم کو ہدایت بخشی اور آخر سے تمھارا خون بہایا جانا بند کیا حکومت کی ایک مدت ہے اور دنیا چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اللہ نے نبی کریمؐ سے کہا ہے یہ دنیا فتنہ ہے اور مدت معین تک کا سرمایہ ہے۔

کتاب الامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۱۳۶ مطبوعہ فتوح ادبیہ مصر ۱۳۳۱ھ پر ہے کہ جب بعد صلح امام حسن علیہ السّلام کو لوگوں نے اُبھارا اور کہا کہ جب معاویہ نے معاہدہ کی پابندی نہیں کرنے کا اعلان کر دیا ہے تو آپ بھی عہد توڑ دیں، اس کا جواب آپ نے یہ فرمایا:

"جو کچھ تم کہتے ہو میں خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ اگر میں دنیا کی حکومت کے لیے پیش بندی کرتا، دنیا کے لیے کوئی کام کرتا یا دنیا میرا نصب العین ہوتی تو ہرگز معاویہ مجھ سے جنگ میں زیادہ سخت نہ ہوتا۔ اور میری رائے اور رویہ اس کے خلاف ہوتا جو تم اب دیکھ رہے ہو۔ لیکن میں خدا اور تم سب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میرا مطلب اور کچھ نہیں صرف تمھاری جان بچانا ہے، تم میں سے رفع فساد کرنا ہے۔ تو تم لوگ خدا سے ڈرو اور قضائے الٰہی پر راضی رہو۔ اپنے امور خدا کے حوالہ کر دو اور اپنے گھروں میں بیٹھ جاؤ اور ہاتھ روکے رہو یہاں تک کہ یا تو نیکوکار راحت پا جائے یا بدکار سے لوگ امن میں ہو جائیں۔"

اس عبارت سے بھی ظاہر ہے کہ صلح سے مقصد خوں ریزی کا روکنا تھا، اگر صلح نہ کرتے تو خون رائیگاں جاتا۔ اس ارشاد کے آخری جملے خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں۔ علّامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغہ جلد چہارم ص ۲۲ مطبوعہ میمنیہ مصر پر لکھا ہے:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر امام حسنؑ کے لیے امکان ہوتا تو ضرور جنگ کرتے۔ لیکن جس کا کوئی مددگار نہ ہو اس کے لیے کیا چارہ

ہے۔ مثل ہے کہ :

"کہیں بے بال و پر باز اُڑ سکا ہے"

محدثین و مورخین کی ان تحریروں سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ اعوان و انصار کا فقدان باعثِ التوائے جنگ ہوا۔ ایسی حالت میں جان بوجھ کر شکست کھانے کو جنگ کرنا کبھی مقتضائے عقل نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک ہی صورت باقی تھی کہ مطمح نظر اور مقصد کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کرتے ہوئے صلح کر لی جائے اور قاعدہ اقل القبحین جس پر ذیل کے عقلاء کا اتفاق ہے اسی امر کی تائید کرتا ہے۔

مقدمہ میں ظاہر ہی کیا جا چکا ہے کہ صلح سے صرف مقابل کی حقیت ثابت نہیں ہوتی۔ امام حسنؑ کے بیانات اس امر میں ایسے واضح ہیں کہ پھر کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ نے بار بار اعلان فرمایا ہے کہ حق میرا ہے لیکن معاویہ پرست حضرات نے اس موقع پر معاویہ کی حقیت ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی ہے۔ جس کا ان کو جتنا نفع پہونچتا ہے اس سے زیادہ ان کا مذہب داغدار ہو جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ مدعیان اسلام میں اگر ایسے لوگ نہ پیدا ہوتے تو اہلبیت اور دین رسول کو جتنا صدمہ پہونچا ہے نہ پہونچتا۔ اصل یہ ہے کہ مسئلہ خلافت و امامت کو کچھ ایسا مجمع تضاد و تناقص بنا دیا گیا ہے کہ جب ایک طرف سے درست کیا جاتا ہے تو دوسری طرف سے دھچکا پہونچ جاتا ہے اور جب دوسری طرف سے درست کیا جاتا ہے تو کسی اور طرف سے رخنہ نظر آنے لگتا ہے۔ اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم[1] اور الصحابۃ

---

[1] میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں، جس کسی کی اقتدا کرو ہدایت پاؤ گے۔

کلھم عدول[1] کہہ کر توصحابیت کا سن پروف (sin proof) بنا دیا گیا جس سے تمام صحابہ ہر قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور کسی کی اقتدا کی جائے باعثِ نجات ہو جائے اور قرآن کی آواز فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ[2] اور ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت[3] بتلاتی ہے کہ اصل معیار نجات و تحسین صرف ایمان و عمل ہے اور کوئی معیار اس کے سوا نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کی جماعت میں ایک دوسرے سے اس درجہ خلاف ہے کہ اگر ایک کی اقتدا کی جائے تو دوسرے سے عداوت مول لینا پڑتی ہے اور اگر دوسرے کا اتباع کیا جائے تو کسی اور سے اختلاف بغیر چارہ نہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی تو خلافت نری دنیاوی حکومت بن جاتی ہے اور اس کی کل خوبیوں کو سلاطین دنیا کے اصول سے لائق تحسین و آفریں قرار دیا جاتا ہے چاہے اس میں قرآن و حدیث کی کیسی ہی مخالفت ہوتی ہو اور کبھی دینی بن جاتی ہے اور اس کا اعتقاد کیے بغیر نجات ندارد سمجھی جاتی ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ خاطی خلفائے ثلثہ کی ولایت و محبت بھی ہو اور اہلبیت معصومینؑ کی اطاعت و مودۃ بھی، علیؑ بن ابی طالب کی جنت بھی مانی جائے اور طلحہ و زبیر و عائشہ کی حقیّت بھی، علیؑ کی محبت بھی ہو اور معاویہ سے الفت بھی (حالانکہ ایک دوسرے پر لعنت کرتے رہے ہوں) یہ کیونکر

---

[1] میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں جس کسی کی اقتدا کرو ہدایت پاؤ گے، صحابہ سب کے سب عادل ہیں۔

[2] جو ذرہ برابر نیکی کرے گا نیکی پائے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا برا دیکھے گا۔

[3] یقیناً انسان گھاٹے میں ہے سوا اہل ایمان اور نیکوکار کے۔

ہوسکتا ہے کہ امام حسنؑ کی طرف داری بھی کی جائے اور معاویہ کی ہواخواہی بھی (حالانکہ ایک مقتول اور دوسرا قاتل) یہ کب سمجھ میں آسکتا ہے کہ یزید بن معاویہ کی خلافت بھی درست ہو اور امام حسین علیہ السلام کی امامت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ اسی طرح کی بے شمار متضاد اور ناممکن الاجتماع باتیں لوگوں کو خبط عشواء میں مبتلا ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔ خلافت پر بحثیں ہو چکی ہیں اس موقع پر طول دینا مقصود نہیں۔ بہرحال شیعوں کی حیثیت اس باب میں واضح اور بالکل غیر مشتبہ ہے یعنی اہلبیتؑ اور محض اہلبیتؑ تمام معاملات میں حق پر تھے۔ اہلبیت طاہرینؑ کی غیر مشروط اطاعت و محبّت واجب ہے اور ان کے مخالفین و محاربین قطعاً غلطی پر تھے اور اس بنا پر اُن سے نفرت و بیزاری لازمی ہے (دیکھو کتب اسلامیہ)۔ اہلبیتؑ اور ان کے مخالفین دونوں کو برسر حق سمجھنے کا گورکھ دھندا تمام اہلسنت کی عقائد و کلام کی کتابوں میں پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو معاویہ پرستی کا یہ زور کہ صاحب صواعق محرقہ نے "تطهير الجنان واللسان عن المحظور والتفوه بثلب سيدنا معاوية بن ابی سفيان" نام کی کتاب لکھ ماری۔ دوسری طرف امام نسائیؒ غریب نے جب منبر دمشق پر فضائلِ اہلبیتؑ بیان کیے اور کسی نے پوچھا کچھ معاویہ کے متعلق بھی ارشاد ہو، امام نسائیؒ نے فرمایا کہ اگر معاویہ سر بسر ہو جائیں یہی کیا کم ہے کہ ان کی کوئی فضیلت بیان کی جائے۔ مجھے تو ان کے حق میں سوائے لا اشبع الله بطنه (خدا اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے) اور کوئی حدیث نہیں ملتی۔ جس کے نتیجہ میں منبر سے کھینچ کر مدّعیانِ اسلام و تسنن نے ایسی رسوائی سے امام صاحب کی مرمّت کی کہ وہ جاں بحق ہو گئے (دیکھو تاریخ ابن خلکان) اور اس پر طرّہ اور لطیفہ یہ ہے کہ آج اہلسنت دونوں (ابن حجر اور نسائیؒ) بزرگوں کو امام بھی کہے چلے جاتے

ہیں۔ مثالیں بہت ہیں کہاں تک بیان کی جائیں۔

اب ہم اس موقع پر مولوی عبید اللہ صاحب بسمل امرتسری کی کتاب ارجح المطالب مطبوعہ لاہور سنہ ۱۳۴۰ھ باب چہارم کی عبارت لفظ بہ لفظ نقل کرتے ہیں جس سے معاویہ کے متعلق رائے قائم کرنے میں سہولت ہوگی۔ یہ تحریر امیر المومنینؑ اور معاویہ کی جنگ کے متعلق ہے، اسی سے یہ بھی پتہ چلنا آسان ہو جاتا ہے کہ امام حسنؑ کے لیے کیا مجبوری تھی کہ آپ نے صلح کی جب معاویہ پرستی کی حد آج یہ ہے کہ صاحب ارجح المطالب کو اس کی رد اور اس پر استدلال کرنے کی ضرورت ہے، تو جب معاویہ شاہی رہی ہوگی اس وقت کس کی طاقت تھی جو معاویہ کو از سر تا پا برسر حق نہ کہتا۔ صاحب ارجح المطالب لکھتے ہیں :

"جناب امیرؑ کا ناکثین اور قاسطین اور مارقین سے جنگ کرنا۔

علقمہ اور اسود کہتے ہیں کہ جب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ صفین سے لوٹے تو ہم ان کے ملنے کو گئے۔ ہم نے ان سے کہا اے ابو ایوب! بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم کیا کہ تمہارے گھر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم فروکش ہوئے اور یہ خدا کی مہربانی خاص تمہارے لیے تھی کہ حضرت کی اونٹنی اور لوگوں کے سوا تمہارے گھر کے دروازے پر بیٹھ گئی، اب آپ کندھے پر شمشیر رکھ کر تشریف لائے ہیں کہ اس سے لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو قتل کریں۔ ابو ایوب انصاری کہنے لگے، تحقیق جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے ہم کو جناب امیرؑ کی معیت میں تین گروہوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ لوگ ناکثین اور قاسطین

اور مارقین ہیں۔ پس ناکثین اہل جمل یعنی طلحہ و زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما)[1] تھے اور قاسطین یہ لوگ ہیں جہاں سے کہ ہم واپس آرہے ہیں یعنی معاویہ اور عمرو بن عاص اور مارقین اہل طرفا اور نخیلان اور نہروان ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ہیں؟ لیکن انشاء اللہ ان کے ساتھ بھی لڑنا ہے۔"

تنبیہ :

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیرؑ کو اپنے عہدِ خلافت میں تین معرکے پیش آئے :

(۱) واقعہ جمل (۲) واقعہ صفّین (۳) واقعہ نہروان

واقعہ جمل میں دونوں جانب سے صحابۂ کرام تھے۔ اس واقعہ پر گہری نظر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اصحاب جمل یعنی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے نکث بیعت تو ضرور کیا ہے مگر ان کا منشاء[2] جناب امیرؑ سے نہ نزع خلافت کا تھا اور نہ لڑنے ہی کا ارادہ تھا۔ بلکہ واقعات پر غور کرنے سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جنگ میں بھی مبادرت ان سے نہیں ہوئی صرف وہ قاتلان جناب عثمان کے متدعی تھے جو بخوف جان جناب امیرؑ کی فوج میں آچھپے تھے۔ انھوں نے موقع پا کر دونوں لشکروں کو لڑوا دیا۔ مگر جب جناب امیرؑ نے طلحہ و زبیر کو ان کی خطا پر متنبّہ کیا تو

---

[1] ناکثین میں ہونا جن کے ساتھ لڑنے کا حکم خود رسول دے گئے، پھر رضی اللہ کا طرّہ سر پر سبحان اللہ!

[2] رسولؐ نے ناکثین کی مذمت کی ہے نہ کہ اُن کے منشا کی۔

وہ نادم ہو کر فوراً معرکے سے علیحدہ ہو گئے اس لیے ان کی خطا فی الاجتہاد سے علماء نے تعبیر کیا ہے[1]

۲۔ معرکۂ صفین میں تمام مہاجر اور انصار جناب امیرؑ کے طرفدار تھے، معدودے چند مولفۃ القلوب صحابہ امیر معاویہ کی طرفداری کرتے تھے۔ واقعات پر نظر کرنے سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کی منشا اس جنگ سے نزع خلافت کی تھی۔ گو متاخرین ان کے فعل کو کسی لفظ سے تعبیر کریں مگر خطائے منکر ہی کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔

۳۔ واقعۂ نہروان میں کوئی صحابی جناب امیرؑ کے مخالف نہیں ہوا اس لیے اس کی بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ واقعۂ جمل کی بحث صفین کے واقعہ کی بحث میں ضمناً درج ہے اس واسطے اہلِ صفّین کے اس فعل کی نسبت مفصلہ ذیل بحث درج کی جاتی ہے:

"ابن عمر کہا کرتے تھے کہ اس امت کے لوگوں میں سے قیامت کے روز سب سے پہلے خدا کے سامنے علیؑ اور معاویہ باہم جھگڑنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔"

(مناقب الصحابہ)

---

[1] اس تاویل کی کمزوری واضح ہے مگر کیا کیا جائے کہ سُنیت کا عقیدہ رکھتے ہوئے سوائے اس کے اور کیا کریں، ورنہ واضح ہے کہ علی بن ابی طالبؑ سے جنگ کو احادیث میں صاف صاف کفر بتا دیا جا چکا ہے۔ اگر امر رسول کی پابندی ہے تو علیؑ کے مقابلہ والوں کو صاف صاف ناحق پر کہنا چاہیے۔ یہ لطیفہ بھی مزیدار ہے کہ امیر معاویہ کی منشاء تو خلافت لینا تھی اور طلحہ و زبیر کی منشاء باوجود تصریح امیر المومنین نزع خلافت نہ ماننا کیا خوب فیصلہ ہے۔

تمہید :

یہ امر واضح ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اعلیٰ مدارج تعظیم اور کثرت ثواب کا مجوز اور تزاید حسنات کا موجب ہے۔ کوئی شرف خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کی حد تک نہیں پہونچ سکتا[1]۔ لیکن ہم اہلسنت والجماعت کے نزدیک انبیاء کرام علیہ السلام کے سوا کوئی صاحب خواہ کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہوں معصوم نہیں۔ البتہ وہ عظیم الشان اصحاب کبار جن کے فضائل و مناقب متواترات کی حد تک پہونچ چکے ہیں، محفوظ عن الخطا سمجھے جاتے ہیں اور ان بزرگوں کی شان میں صدور معصیت کا گمان کرنا سراسر ظن فاسد ہے[2]۔

اس امر کے متعین کرنے میں کہ وہ افاضل صحابہ کون ہیں اور کتنے ہیں جن کے فضائل تواتر کی حد تک پہونچ گئے ہیں۔ علمائے کرام نے نہایت دقت نظر صرف کر کے یہ تنقیح نکالی ہے کہ جو بزرگوار صلح حدیبیہ تک اسلام سے مشرف[3] ہوئے ہیں وہ ہر طرح سے افضل اور اعلیٰ ہیں اس کے بعد پھر کوئی ایسا مشہد نہیں جو معیار فضل سمجھا جائے کیونکہ بعد میں اکثر منافق بھی شریک اسلام ہو گئے تھے چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث

---

[1] جب تک ایمان اور عمل صالح کی شرط نہ ہو صحبت بجائے شرف ہونے کے منافقیت اور وبال ہوگی۔

[2] استدلال سے کچھ واسطہ نہیں صرف دعویٰ ہے۔ آیت تطہیر جن لوگوں کے حق میں ہے اس سے عصمت واضح ہے فضائل و مناقب کی کثرت سے غلط کار منافقین ہرگز محفوظ عن الخطا نہیں ہو سکتے۔

[3] بظاہر ان سب کو آپ محفوظ عن الخطا کہنا چاہتے ہیں لیکن ان میں منافقین کی تعداد کافی موجود تھی۔ محفوظ ہونا تو کجا۔

دہلوی اپنے رسالہ سر الجلیل میں لکھتے ہیں (درمیان صحابہ بسبقت تقدم را بموجب لایستوی منکم من انفق قبل الفتح وقاتل اعظم درجتمن الذین انفقوا من بعد وقاتلوا اعتبار باید کرد زیرا کہ ہر قدر تقدم وسبق بیشتر وقت احتیاج اسلام وتقویت آں بیشتر چنانچہ حدیث صدقت وقلتم کذبت دلالت بر آن دارد پس بایں اعتبار کسانیکہ قبل از ہجرت باعمال اسلام قیام نمودہ اند افضل باشند از من بعد خود مثل ابوبکر وعمر وعثمان وعلی وحمزہ وجعفر وعثمان بن مظعون وطلحہ وزبیر ومصعب بن عمیر وعبدالرحمٰن بن عوف وعبداللہ بن مسعود وسعید بن زید وزید بن حارثہ وابوعبیدہ وبلال وسعد وعمار بن یاسر وابوسلمہ بن عبدالاسد وعبداللہ بن جحش وغیرہم من نظائرہم بعد از اں اہل العقبہ یا اہل بدر بعد باز از اں مشاہد احد تا آنکہ نوبت بصلح حدیبیہ رسید زیرا کہ انزال سکینہ وصفائی قلوب ایشاں منصوص بنص قرآنی است۔ اما بعد از اں پس بالقطع ہیچ مشہدے نیست کہ مدار فضل بر آں بودہ باشد زیرا کہ دریں مشہد جماعت منافقین بودند، قولہ تعالیٰ (ممن حولکم من الاعراب منافقون ومن اھل المدینۃ مردوا علی النفاق۔

جہاں تک نصوص قرآنی کو دیکھا جاتا ہے تو وہ بھی اُنھیں بزرگوں کی علوشان کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب فی معرفۃ اصحاب میں لکھتے ہیں، قال اللہ تبارک وتعالیٰ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا الخ۔ فھٰذا صفۃ من بدر الی تصدیقہ والایمان بہ وازرہ ونصرہ وتصق بہ وصحبہ ولیس کذالک جمیع من راٰہ ولا جمیع من آمن

وستری منزلهم من الدین والایمان وفضائل ذوی الفضل التقدم منهم
فان الله تعالیٰ فضل بعض النبیّین علی بعض وکذالک سائر المسلمین قال
الله تبارک وتعالیٰ السابقون الاولون من المهاجرین والانصار والذین
اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه "یعنی پروردگار تعالیٰ شانہٗ
فرماتا ہے محمدؐ اللہ کا رسول ہے، اور جو اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں، کافروں
پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدے میں ڈھونڈھتے ہیں اللہ
کا فضل اور اس کی خوشی، نشانی ان کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر سے، یہ کہاوت ہے
ان کی توریت میں، اور یہ کہاوت ہے ان کی انجیل میں۔ پس جن لوگوں نے حضرت
کی تصدیق کی اور مدد میں مبادرت کی ہے اور آپ کی صحبت میں رہے ان کی
یہ صفت ہے جس کو خدا نے اپنے کلام پاک میں بیان فرمایا ہے اور ہر ایک شخص
کہ جس نے حضرت کو دیکھا ہے ایسا نہیں ہے اور نہ ہر ایک شخص ایمان لایا ہے
ایسا ہو سکتا ہے۔ عنقریب ہے کہ دین وایمان میں تو ان کے درجوں کو دیکھے گا
اور صاحبان فضل کی فضیلتیں اور ان کے تقدم کو شناخت کرے گا، پس خدائے تعالیٰ
نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اسی طرح سے تمام مسلمانوں کو ایک
دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ قدیم میں پہلے
وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیچھے آئے نیکی سے اللہ
ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔"

اس آیت کی تفسیر میں علاّمہ موصوف ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں

السابقون الاولون من المهاجرین والانصار هم الذین صلوا

القبلتین یعنی سابقون الاولون سے وہ لوگ مراد ہیں جن لوگوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ اور شعبی سے روایت ہے الذین بایعوا بیعۃ الرضوان یعنی سابقون الاولون سے وہ لوگ مراد ہیں جو بیعت رضوان سے مشرف ہوئے اور ان کی تعداد کی نسبت علامہ ابن البر لکھتے ہیں عن سالم بن ابی الجعدہ قال سالت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ من اصحاب الشجرۃ قال کنا الفا وخمس مأۃ یعنی سالم بن ابی الجعدہ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اصحاب شجرہ کی تعداد کی نسبت پوچھا، وہ فرمانے لگے ہم پندرہ سو آدمی تھے۔

دوسری روایت میں ہے: عن عمرو قال سمعت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ یقول کنا الفا واربع مأۃ فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتم الیوم خیار اھل الارض۔ یعنی عمرو روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم صلح حدیبیہ کے روز چودہ سو آدمی تھے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ تم آج کے دن تمام زمین کے باشندوں سے بہتر ہو۔ گو بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعداد کی نسبت فرق ہے، لیکن کہا جا سکتا ہے کہ چودہ سو سے کم اور پندرہ سو سے زیادہ اس وقت صحابی نہیں تھے۔ پس جو اصحاب کبار کہ ان مشاہدہ میں حاضر ہوئے ہیں وہ سب بے شبہ قطعی جنتی اور افاضل صحابہ ہیں۔ علامہ ابن عبد البر استیعاب میں لکھتے ہیں: قال ابو عمرو قال اللہ تعالیٰ رضی اللہ من المومنین اذیبایعونک تحت الشجرۃ ومن رضی اللہ عنہ لم یسخط علیہ

ابدًا انشاء اللہ تعالیٰ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لن یلج النار احد شھد بدرًا والحدیبیۃ۔ یعنی ابوعمرو کہتے ہیں کہ پروردگار عالم جلّ جلالہٗ فرماتا ہے' خدا راضی ہو مومنوں سے جب کہ انھوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی' اور جس سے کہ خدا راضی ہوا اس پر کبھی ناراض نہیں ہوگا انشاءاللہ تعالیٰ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم فرماتے ہیں کہ ہرگز وہ شخص دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا جو بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوا ہے غرضیکہ یہ خصائل ان بزرگوں کے ہیں جو صلح حدیبیہ تک مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اگرچہ بعد میں بھی جو اصحاب کہ مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں ان کے فضائل و مناقب بھی حصر میں نہیں آسکتے۔ خاص کر جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف اور صحبت کا ثواب ایسا ہے کہ جس کے سامنے سب خوبیاں گرد ہیں۔ تاہم باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت کے کل صحابہ کا محفوظ عن الخطاء سمجھنا بدیہیات اور معتقدات سلف صالحین کے برخلاف ہے۔

علامہ سعدالدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں' اذلیس کل صحابی معصوم وکل من رای النبی صلعم بالخیر موسوما یعنی جب کہ کل صحابی معصوم نہیں اور نہ ہر ایک شخص کہ جس نے آنحضرت صلعم کو دیکھا ہے نیکی کا نشان رکھنے والا ہے۔

مسطح بن اثاثہ کا جناب اُمّ المومنین عائشہ صدّیقہ کے قذف میں شریک ہونا اور حاطب بن ابی بلتعہ کا آنحضرت کے راز کو افشاء کرنا اور کفّار مکہ کی طرف پوشیدہ خط لکھ کر روانہ کرنا ولید بن عقبہ بن ابی معیط کا شرب خمر کرنا اور ایک صحابی کا غزوۂ خیبر

میں خودکشی کرنا اور ایک صحابی کا زنا کرنا اور ایک صحابی کا منع زکوٰۃ کرنا اور بعض عرب کے قبائل کا آنحضرت کی رحلت کے بعد مرتد ہو جانا، جن کی تنبیہ کے لیے حضرت ابوبکر صدیق نے لشکر کشی فرمائی، ایسے واقعات ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کل صحابہ محفوظ عن الخطاء نہیں تھے اور ان امور کا بعض صحابہ سے سرزد ہونا محفوظ عن الخطاء ہونے کے متناقض ہے۔

جب بعض صحابہ کا یہ حال ہے تو پھر کون سی ایسی وجہ لاحق ہے کہ جس کی وجہ سے ہم امیر معاویہ کو خلیفہ برحق پر بغاوت کرنے میں معذور یا مخطی ماجور تصوّر کریں اور ان کے اس فعل کو معصیت قرار دینے میں کون سی قباحت لازم آتی ہے۔

(تبصرہ ۵): امیر معاویہ فاضل صحابہ میں سے شمار نہیں کیے جاتے، وہ ہجرت میں شریک ہوئے ہیں، بدر میں نہ بیعت رضوان میں کہ ان کے مناقب منصور تصوّر کیے جائیں۔ ان کا اسلام تو بعد مکہ کی فتح کے ہوا ہے جس میں بقول شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی منافق بھی شریکِ اسلام ہو گئے تھے۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں بہ ذیل ترجمہ امیر معاویہ تحریر کرتے ہیں، ھو وابوہ واخوہ من مسلمۃ الفتح یعنی امیر معاویہ اور ان کے والد ابوسفیان اور اُن کا بھائی فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے۔

امیر معاویہ عامہ صحابہ بلکہ مؤلفۃ القلوب کے گروہ سے سمجھے جاتے ہیں قال ابوعمرو معاویۃ وابوہ من المولفۃ قلوبھم۔ (الاستیعاب للعلامہ ابن عبدالبر واسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ لابن اثیر الجزری واصابہ فی تمیز الصحابہ لابن حجر و تاریخ الخلفاء للسیوطی)۔

ہاں اس معصیت پر اُن کے ارتکاب کو بوجہ شرف صحبت سرورِ عالم صلعم شفاعت نبوی و معافی مرتضوی و عفو خدا کا امیدوار سمجھنا چاہیئے اور ان کو بدالفاظ سے یاد کرنا سخت بُرائی ہے۔ البتہ اُن کو ماجور اور اُن کے اس فعل کو خطاء فی الاجتہاد سمجھنے پر چند اعتراض وارد ہوتے ہیں۔

اوّلاً۔ ظاہر ہے کہ کل صحابہ مجتہدین نہیں تھے۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین احمد بن قاسم العبادی آیات بینات میں لکھتے ہیں: الصحابة تنقسم الی المجتهدین وعوام یعنی صحابہ کی دو قسمیں ہیں، مجتہدین اور عوام۔ ہم کو امیر معاویہ کی چند محدّثات کے سوا جن کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے اُن کے اجتہاد کی کوئی نظیر نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے ہم ان کو صحابہ مجتہد کی قسم سے شمار کر سکیں۔

دوم۔ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امیر معاویہ مجتہد ہی تھے لیکن یہ امر ضروری ہے کہ مجتہد کے قیاس کے لیے ادلہ ثلٰثہ شرعیہ یعنی کتاب و سنت و اجماع سے کسی دلیل کا ماخذ ہونا لازم ہے مگر اُن کے اس فعل میں (یعنی خلیفۂ وقت سے محاربہ کرنے میں) ادلہ مذکورہ سے کسی شرعی دلیل کا ماخذ ہونا ثابت نہیں ہوتا کہ امیر معاویہ نے خلیفۂ وقت کی اطاعت سے انحراف کرنے میں کسی آیت یا حدیث یا مسئلۂ اجماعی سے تمسک کیا ہو۔

سوم۔ مجتہد کو اپنے اجتہاد کرنے میں یا کسی کو راہ صواب کی طرف مائل کرنے میں شمشیر نکالنا اور معرکۂ قتال آراستہ کرنا جس میں ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کی جان تلف ہو جائے، ہرگز جائز نہیں۔

چہارم۔ وہ حیلہ جس سے معاویہ اور ان کے متبعین کو معذور ٹھہرانے میں

کوشش کی جاتی ہے صرف یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص کے طالب تھے نہ خلیفۂ وقت سے انتزاع خلافت کے۔ علامہ ابن حجر نے اسی بات پر زور ڈالا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام سے امیر معاویہ کی معرکہ آرائی صرف قتلہ جناب عثمان کے طلب کرنے کے لیے تھی۔ چنانچہ وہ صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں:

ومن اعتقاد اھل السنۃ والجماعۃ ان ماجری بین معٰویہ وعلی من الحروب فلم یکن المنازعۃ فی الخلافۃ للاجماع علی حقیقتھا لعلی یعنی اہلسنت والجماعت کے اعتقاد میں سے ہے کہ جو محاربات امیر معاویہ اور جناب علیؑ کے درمیان واقع ہوئی ہیں وہ خلافت کا جھگڑا نہیں تھا کیونکہ جناب علیؑ کے خلافت کے حق ہونے پر اجماع ہو چکا تھا۔ علامہ ابن حجر اور ان کے بعض ہم خیال بزرگوں کو اس لیے یہ مسلک اختیار کرنا پڑا ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ جس غرض کے لیے جناب صدیقہ اور طلحہ اور زبیر نے جناب امیرؑ پر خروج کیا تھا اُسی غرض میں امیر معاویہ بھی شریک سمجھے جائیں تاکہ اصحاب جمل کی بریت پر جو ادلہ قائم ہو سکتے ہیں وہی ان کی برارت پر قائم ہو سکیں۔ لیکن یہ بالکل خلافِ نفس الامر ہے، واقعات چھپانے سے چھپ نہیں سکتے۔

اوّلاً۔ اس امر پر تمام اہلسنت کا اتفاق نہیں ہے کہ امیر معاویہ کی غرض اس قتال وجدال سے جناب عثمان کے قاتلوں کا طلب کرنا تھا اور خلافت پر تنازع نہیں تھا۔ چنانچہ عبدالشکور السالمی التمہید فی بیان التوحید میں لکھتے ہیں، وقال اھلسنۃ والجماعۃ بان معٰویۃ فی حال الحیٰوۃ علی ومن تابعہ کانوا مخطئین فی دعوی الامارۃ والبیعۃ والباغین فی المقاتلۃ مع علی یعنی اہلسنت و الجماعت کہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور اُن کے پیرو جناب علیؑ کی زندگی میں امارت اور بیعت

کے دعوے کرنے میں خطاوار تھے اور جناب علی کے ساتھ جنگ کرنے میں باغی تھے۔
بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی "سیف المسلول" میں لکھتے ہیں:

"بعض گویند کہ معاویہ درابتدا طلب قاتلان عثمان می کرد و درآخر طلب خلافت ہم نمودہ بود و بصحت خلافت علی قائل نبود و می گفت کہ بیعت او باشان با علی معتبر نیست و اہل حل و عقد صحابہ مثل طلحہ و زبیر وغیرہ کہ بیعت کردہ بودند باکراہ کردہ بودند ولہذا انکث بیعت نمودند و معاویہ از پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بود واذا ملکت فارفق بھم ازیں حدیث او را طمع خلافت ہم رسیدہ بود از اہل شام بیعت گرفتہ بود۔

(دوم) اگر معاویہ کا مقصود محض قصاص کا طلب کرنا تھا تو لازم تھا کہ اُن کی ہمت صرف حضرت عثمان کے قاتلوں کے طلب کرنے ہی پر مقصود ہوتی اور اسی پر اکتفا کرتے۔ تسخیر مال اور بیت المال میں دست اندازی نہ کرتے لوگوں سے اپنے نام کی بیعت نہ لیتے اور کبیر الروم کو مال کثیر دے کر صرف جناب امیرؑ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے صلح نہ کرتے۔ مسعودی علیہ الرحمہ مروج الذہب میں لکھتے ہیں:

قد کان معاویۃ صالح الروم علی مال یحملہ الیہ لشغلہ بعلی

یعنی امیر معاویہ نے ملک الروم کو مال دے کر اس لیے صلح کر لی تھی تاکہ علیؑ کے جنگ کرنے میں مشغول ہوں اور اپنے عامل عمرو بن العاص کو بھیج کر جناب امیرؑ کے عامل محمد بن ابی بکر سے مصر کو نہ چھین لیتے۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ میں علامہ ابن اثیر الجزری بذیل ترجمہ عمرو بن العاص لکھتے ہیں:

ثم سیرہ معاویہ الی مصر فاستنقذھا من ید محمد بن ابی بکر

وھو عامل لعلی علیھا واستعملہ معاویہ علیھا یعنی پھر امیر معاویہ نے اس کو مصر کی طرف روانہ کیا اور اُس نے مصر کو محمد بن ابی بکر سے چھین لیا، اور وہ جناب علیؑ کی طرف سے اس پر عامل تھے۔ پھر امیر معاویہ نے اس پر عمرو بن عاص کو اپنا عامل مقرر کیا۔ یہ اور نیز اسی قسم کے صدہا دیگر واقعات ایسے موجود ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کو دراصل خلافت کی طمع تھی۔

سوم۔ جب کہ تحکیم ہو چکی تھی اور عمرو عاص نے ابو موسیٰ کو مغالطہ دے کر بحق امیر معاویہ فیصلہ کیا تھا تو ضعیف سے ضعیف روایت بھی اس کی تائید نہیں کرتی کہ امیر معاویہ نے اس ناجائز تحکیم پر عمرو بن عاص کو سرزنش کی ہو۔ پس اگر امیر معاویہ مدعی خلافت نہیں تھے تو ایسی ناجائز تحکیم پر کیوں راضی ہو گئے تھے۔

چہارم۔ جب امام حسنؑ نے خلافت سے دست کش ہو کر امارت عامہ ان کے سپرد کی اور امیر معاویہ کو ان کے حسب منشاء اقتدار کلی حاصل ہو گیا تھا تو آیا کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پھر کبھی امیر معاویہ نے جناب عثمان کے قاتلوں کی جستجو کی ہے یا اس جماعت پر قصاص کے جاری کرنے کا حکم مشتہر کیا ہے باوجودیکہ حضرت عثمان کی شہادت سے امیر معاویہ کی امارت عامہ تک چھ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا، اور یہ امر ہرگز خیال میں نہیں آتا کہ اس قلیل مدت میں حضرت عثمان کے قاتل کلھم رہ گرائے عدم ہو گئے ہوں اور اس جماعت کثیر سے ایک متنفس بھی زندہ نہ رہا ہو، جس سے قصاص طلب کیا جاتا۔ خیر بہ طریق تنزل ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ امیر معاویہ کا مقصود اس محاربہ سے جناب عثمان کے قاتلوں کو طلب کرنا تھا۔ اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر اس بغاوت

میں امیرِ معاویہ کو معذور سمجھا جائے تو اُن کے مقلدین کو بھی معذور خیال کرنا چاہیئے،
پس بصورت ذیل :

(الف) اگر کوئی شخص بادشاہ اسلام سے بدیں وجہ بغاوت اختیار کرے کہ چونکہ یہ بادشاہ فلاں مقتول مسلمان کے قاتلوں سے قصاص نہیں لیتا اس لیے میں اُس کے ساتھ جنگ کرتا ہوں اور میں اس امر میں امیرِ معاویہ کا مقلد ہوں' تو آیا کوئی فقہی جزئیہ اس کی تائید کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے یا کوئی عالم اس تقلید میں اس کو معذور سمجھ سکتا ہے۔

(ب) مقتول کے خون کے لیے عندالشرع دعویٰ کرنا محض اسی طرح جائز ہے کہ قاضی کی طرف رجوع کیا جائے اور شہود پیش کر کے دعویٰ کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا جائے اور پھر شریعت کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے نہ یہ کہ بادشاہ وقت پر شمشیر نکالی جائے اور اس کی معزولی کے درپے ہو جائے۔

(ج) اگر اس بغاوت کو خطا فی الاجتہاد کے بھی ایک ثواب حاصل ہوتا ہے (اور عنداللہ معذور بلکہ ماجور ہوتا ہے) تصوّر کیا جائے تو بالفرض اگر جناب امیر علیہ السلام اس معرکہ قتال میں مثل اپنے دیگر صحابیوں کے شہید ہو جاتے تو ضرور رہے کہ جناب امیرؑ کا قتل بھی خطا فی الاجتہاد ہوتا اور جناب امیرؑ کے قاتل اشقی الآخرین کو بھی عنداللہ معذور بلکہ ماجور سمجھا جاتا۔ (نعوذ باللہ من ہذا الاعتقاد)

(د) اگر معاویہ بغاوت میں مخطی ماجور تھے تو اُن کے لشکر سے جس نے کہ جناب عمار یاسر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا ہے اس کو مخطی ماجور کہنا پڑے گا، کیونکہ یہ فعل اُس نے بغرض اتباع امیر معاویہ کیا ہے۔

(ھ) ولو فرضاً اگر جناب امیر علیہ السلام سے جنگ کرنا خطافی الاجتہاد تھا تو کیا جناب امیرؑ کی شان اقدس میں برسر محراب و منبر سبّ و شتم کرانا بھی خطا فی الاجتہاد تھا؟ عن سعد ان معاویۃ امرہ فقال ما یمنعک ان تسب ابا التراب فقال اما ذکرت ثلاثا قالھن رسول اللہ صلعم فی بعض مغازیہ فقال لہ خلفتنی من النساء والصبیان... اھل بیتی (اخرجہ احمد والمسلم والترمذی والنسائی وغیرھم) سعد سے روایت ہے کہ امیر معاویہ نے اُن کو جناب ابوتراب علیہ السلام پر سبّ کرنے کے لیے حکم کیا، اور کہا تم ان پر سبّ کیوں نہیں کہتے؟ سعد نے کہا کیا میں نے تم سے تین باتوں کا ذکر نہیں کیا کہ رسول خدا صلعم نے ارشاد کی ہیں۔ حضرتؐ نے علیؑ کو بعض غزوات میں جب کہ اپنے عقب میں چھوڑا تو انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! آپ مجھے عورتوں اور لڑکوں کے پاس چھوڑے جاتے ہیں۔ حضرتؐ نے اُن سے فرمایا کیا تو راضی نہیں کہ تیری منزلت مجھ سے ایسی ہو جیسے ہارون کی موسیٰؑ سے مگر نبوت میرے بعد نہیں ہے اور میں نے خیبر کے روز حضرتؐ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ ہم عَلَم کل ایسے شخص کو دیں گے جو خدا اور رسولؐ سے پیار کرتا ہے پس ہم عَلَم کی طرف بڑھے اور آپ نے ارشاد کیا علیؑ کہاں ہیں وہ اُن کی خدمت میں آشوب چشم ہی سے حاضر ہوئے۔ حضرت نے اپنا لعاب دہن اُن کی آنکھوں میں لگا کر عَلَم اُن کو دیا اور اللہ نے ان کو فتح دی، اور جب یہ آیت نازل ہوئی: "پس کہہ دو آؤ بُلائیں ہم اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو اور اپنی جانوں کو اور تمھاری جانوں کو"۔ حضرت نے علیؑ، فاطمہؑ اور حسنینؑ کو بُلا کر فرمایا اے میرے پروردگار! یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔

یہ حدیث تو صحاح کی ہم نے پیش کی ہے، اسی قسم کی صدہا حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ نے اس بدعت کو خطبہ میں ایجاد کیا تھا جو خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے عہد تک جاری رہی اور اس نامور خلیفہ نے اُس کو منسوخ کیا۔ یہ ایسے واقعات محققہ ہیں کہ جس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ پس کیا یہ امور اور بدعت سیئہ بھی خطا فی الاجتہاد ہو سکتے ہیں، حاشا وکلا۔ اکثر لوگوں کو مفصلہ ذیل اوہام میں سے ایک نہ ایک وہم نے اس محاربہ کو خطا فی الاجتہاد کہنے کی طرف مائل کیا ہے، جن کی تفصیل مع جوابات درج ہے:

پہلا وہم۔ اگر اس محاربہ کو معصیت قرار دیا جائے تو اس سے اہل شام کی تکفیر لازم آتی ہے، اور یہ امر دور تک پہونچ جاتا ہے لیکن یہ وہم بالکل بادر ہوا ہے اور ادنیٰ تامل سے رفع ہو سکتا ہے کیونکہ خلیفہ وقت سے محاربہ کرنا معصیت ہے نہ کفر اور حدیث حربک حربی کفر پر دال نہیں چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ کے بارہویں باب میں شرح و بسط کے ساتھ اس پر بحث کی ہے۔ عوام صحابہ سے صدور معصیت کے گمان کرنے میں کسی قسم کا محذور شرعی لازم نہیں آتا۔ ولید بن عقبہ ابن ابی معیط کا شارب خمر ہو کر حد شرعی کو پہونچنا کتب رجال سے ثابت ہے۔ عن ابی جعفر محمد بن علی جلد علی الولید بن عقبۃ فی الخمر اربعین جلد ا۔ (استیعاب و اسد الغابہ و اصابہ) یعنی امام ابو جعفر محمد باقر بن علی زین العابدین علیہ وآبائہ السلام سے مروی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے ولید بن عقبہ کو شراب پینے پر چالیس دُرّے لگائے تھے۔ اسی طرح سے مسطح بن اثاثہ کا جناب صدیقہ کے افک میں کوشش کرنا اور قذف کی حد کو پہونچنا انھیں کتابوں

سے واضح ہے وکان ممن خاض فی الافک علی العائشۃ فجلدہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (اسد الغابہ) یعنی مسطح بن اثاثہ ان لوگوں میں سے تھا جو جناب ام المومنین عائشہ کی نسبت بہتان کھڑا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ پس آنحضرت صلعم نے اُس کو دُرّے لگوائے۔ ان امور سے نہ یہ لوگ درجہ صحابیت سے ساقط ہوگئے اور نہ کافر ہوگئے۔ اگر ہے تو صرف اس قدر کہ اُن سے خطا وقوع میں آئی، اور صدور معصیت سے آدمی کافر نہیں ہوسکتا۔ صحابیت کا شرف ایسا ہے کہ کسی معصیت سے بجز ارتداد کے زائل نہیں ہوسکتا۔

دوسرا وہم — چند اصحاب اس محاربہ میں امیر معاویہ کے شریک تھے، جب امیر معاویہ کے اس فعل کو خطائے منکر اور معصیت قرار دیا جائے تو اُن اصحاب کا امیر معاویہ کے ساتھ معصیت پر اتفاق کرنا لازم آئے گا اور آنحضرت صلعم کے صحابہ پر ایسا گمان فاسد زیبا نہیں ہے۔

یہ وہم اکثر عدم تتبع کتب سیر اور احادیث کی وجہ سے ناشی ہوتا ہے اگر بہ نظر امعان کتب سیر اور رجال کو دیکھا جائے تو بجز عمرو بن العاص اور بشیر بن نعمان کے کوئی صحابہ اس امر میں امیر معاویہ کا شریک نظر نہیں آئے گا۔ اور یہ دو تین صاحب افاضل صحابہ میں شمار نہیں کیے جاتے حرب صفین میں تمام انصار و مہاجرین اور بدریین جناب امیر علیہ السلام کے ربقہ اطاعت میں دکھائی دیتے ہیں، اگرچہ بعض اصحاب مثل عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص اس باہمی مقاتلہ سے کہ دین میں ایک امر جدید[1] تھا اور وہ کفار سے جہاد کرنے کے خوگر ہو چکے تھے کنارہ گزیں ہوگئے

---

[1] اس سے قبل بھی ایسے واقعات قتل مالک و جنگ جمل کے ہو چکے ہیں، یہ امر جدید نہیں ہے۔

تھے۔ لیکن ان کی کنارہ گزینی اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ جناب امیرؑ کی خلافت میں شک و شبہ رکھتے تھے بلکہ انھیں بزرگواروں سے اس کنارہ گزینی کے متعلق ان کی ندامت اور جناب امیرؑ کے ساتھ شرکت نہ کرنے پر حسرت ثابت ہے۔

اسد الغابہ میں علامہ ابن اثیر الجزری روایت کرتے ہیں، عن عبد اللہ بن جبیب قال اخبرنی قال قال ابن عمر حین حضرہ الموت ما احد فی نفسی من الدنیا الا لم اقاتل الفئۃ الباغیۃ یعنی عبد اللہ بن جبیب اپنے والد سے ناقل ہے کہ جب عبد اللہ بن عمر کی وفات کا وقت قریب آگیا تو کہنے لگے کہ میرے دل میں دنیا کی کوئی حسرت باقی نہیں رہی مگر یہ کہ میں باغی گروہ سے نہیں لڑا۔ عن جیبب بن ابی ثابت عن بن عمر انہ قال ما آلمنی علی شیئ الا انی لم اقاتل مع علی بن ابی طالب الفئۃ الباغیۃ یعنی جیبب بن ثابت کہتا ہے کہ عبد اللہ بن عمر کہا کرتے تھے کہ مجھے کسی بات کی حسرت باقی نہیں رہی مگر یہ کہ جناب امیرؑ کے ساتھ ہو کر میں باغیوں کے گروہ سے نہیں لڑا۔ عن حیثمہ بن عبد الرحمٰن قال سمعت سعد بن مالک وقال لہ رجل ان علیا یقع فیک انک تخلفت عنہ فقال سعد واللہ انہ لرای رایتہ واخطاء اخرجہ الحاکم فی المستدرک۔ (حیثمہ بن عبد الرحمٰن کہتا ہے کہ سعد بن مالک سے کسی نے کہا کہ جناب امیر علیہ السلام اچھا نہیں کہتے کیونکہ تم نے اُن کی بیعت سے تخلّف کیا ہے۔ وہ کہنے لگے یہ بھی ایک رائے تھی جو میں نے سوچی تھی، لیکن رائے غلط نکلی)۔ اگرچہ بعض صحابہ بتقاضائے بشریت ابتدا میں جناب امیرؑ سے کنارہ گزیں تھے مگر عمار یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقع ہونے سے اُن کی مخالفت اور کنارہ گزینی

جاتی رہی تھی۔ قال الشعبی ما مات مسروق حتیٰ تاب الی اللہ تعالیٰ عن تخلفہ مع علی (اسد الغابہ) یعنی شعبی کہتے ہیں کہ مسروق نہیں فوت ہوئے جب تک کہ انھوں نے خدا کی جناب میں جناب امیرؑ سے جنگ میں مخالفت کرنے سے توبہ نہیں کی۔

تیسرا وہم۔۔ امیر معاویہ کی نسبت خطائے منکر تجویز کرنے سے الصحابۃ کلھم عدول کا کلیہ ٹوٹتا ہے جس سے امور دین میں ایک بڑا بھاری تزلزل پیدا ہو جاتا ہے اور روایات کا سلسلہ درہم و برہم ہو جاتا ہے لیکن الصحابۃ کلھم عدول سے محفوظون عن المعاصی کسی نے مراد نہیں لیا، بلکہ عدل فی الروایۃ مراد لیا ہے۔ چنانچہ علامہ تاج الدین السبکی جمع الجوامع میں لکھتے ہیں والاکثر علی عدالۃ الصحابۃ وقیل کغیرھم وقیل الی قتل عثمان وقیل الا من قاتل علیا۔ یعنی اکثر علماء صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں، بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ صحابہ بھی عدالت میں دوسروں جیسے ہیں۔ بعض نے یہ کہا کہ جناب عثمان کے قتل تک سب صحابہ عدول تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ سب صحابہ عدول ہیں مگر وہ لوگ جو جناب امیرؑ سے لڑے ہیں وہ عدول نہیں۔ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ الصحابۃ کلھم عدول سے صرف عدل فی الروایت مراد ہے اگرچہ اس میں بھی بعض ائمہ نے کلام کیا ہے۔

عبارت مندرجۃ الصدر جمع الجوامع کا متن ہے، علامہ جلال الدین محلی صاحب نے نصف آخر تفسیر جلالین میں جو اس کتاب پر شرح لکھی ہے جو شرح جمع الجوامع کے نام سے مشہور بین العلماء ہے اس کی عبارت کو ملاحظہ کیا چاہیئے، وہ لکھتے ہیں:

"اکثر علمائے سلف و خلف عدالت صحابہ کے قائل ہیں کہ روایت و شہادت میں اُن کی عدالت سے بحث نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ تمام امت

سے بہتر ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے تمام امت سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ اس حدیث کو شیخین یعنی بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے اگر کسی صحابی سے کوئی فعل بد سرزد ہوا ہو تو اس کے موافق عمل کیا جائے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ صحابہ بھی روایت اور شہادت میں مثل دیگر اشخاص کے ہیں اُن کی عدالت سے بھی بحث کی جائے گی مگر وہ اصحاب جن کی عدالت ظاہر ہو مثل شیخین ابوبکر و عمر کے اور بعض علماء کا قول ہے کہ تمام صحابی جناب عثمان کی شہادت تک عدول تھے اور ان کے قتل کے بعد اُن میں فتنہ واقع ہونے کی وجہ سے اُن کی عدالت سے بحث کی جائے گی۔ بعض خوض کرنے سے رُک گئے ہوئے ہیں۔ بعض علماء کا مقولہ ہے کہ تمام صحابی عدول ہیں مگر جن لوگوں نے جناب امیرؑ سے جنگ کی ہے پس وہ لوگ فاسق ہیں امام برحق پر خروج کرنے کی وجہ سے۔"

علامہ شہاب الدین بن احمد بن قاسم العبادی نے شرح جمع الجوامع پر ایک مبسوط حاشیہ لکھا ہے اور اُس کا نام آیات بیّنات رکھا ہے، اس فقرہ ومن طرء له قادح کی توضیح میں لکھتے ہیں نبته به علی عدم عصمتهم یعنی صاحب متن نے اس مقولہ سے صحابہ کی عدم عصمت سے آگاہ کیا ہے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں:

"صحابہ سے جو محاربات و منازعات وقوع میں آئے وہ کتب تاریخ میں درج ہیں اور ثقہ لوگوں کی زبانوں پر مذکور ہیں بظاہر اس امر پر دال ہیں کہ بعض صحابہ طریق حق سے تجاوز کر کے حسد و فسق و ظلم کو پہونچ گئے

اور باعث اس کا کینہ، عناد اور حسد اور شدت، خصومت اور طلب ملک و ریاست و شہوات نفسانی کی طرف میلان تھا کیونکہ ہر صحابی معصوم اور ہر شخص کہ جس نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کی ہے نیکی کے ساتھ موسوم نہ تھا۔"

ان تمام مباحث سے ثابت ہوا کہ الصحابہ کلھم عدول سے عدل فی الروایۃ مراد ہے نہ معصوم عن المعاصی اور صحابہ عدول فی الروایۃ اس لیے تسلیم ہوئے ہیں کہ جب علماء نے طبقات رجال میں قوانین جرح و تعدیل کو جاری کیا ہے تو صرف بہ نسبت دیگر طبقات کے صرف صحابہ ہی کا گروہ وضع احادیث سے بچتا ہوا پایا ہے۔

چوتھا وہم ــ اگر اس محاربہ کو معصیت قرار دیا جائے تو اہل شام جن میں بعض صحابہ بھی شریک تھے موعود بوعید نار تصور کیے جائیں گے اور وعید نار مستلزم کفر ہے لیکن وعید نار بھی مستلزم کفر نہیں کیونکہ دوسرے معاصی مثل شرب خمر، زنا و سرقہ وغیرہ کی سزا بھی دوزخ ہے جو توبہ اور شفاعت نبوی اور عفو ایزدی سے ٹل سکتا ہے۔ اسی طرح اہل صفین کی حفاظت کی نسبت بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ توبہ سے یا آنحضرت صلعم کی شفاعت سے یا عفو باری سے ٹل جائے۔

پانچواں وہم ــ اگر جناب امیر علیہ السلام سے امیر معاویہ کے محاربہ کو معصیت قرار دیا جائے تو جناب عائشہ صدیقہ ام المومنین اور طلحہ و زبیر کے محاربہ کو بھی معصیت قرار دینا پڑے گا۔ یہ وہم بھی عدم تتبع کتب سیر و تواریخ سے ناشی ہوتا ہے اس کا جواب بچند وجوہ دیا جا سکتا ہے:

(الف) اصحاب جمل کی غرض امیر معاویہ کی غرض سے بالکل متبائن تھی جس کی تفصیل ہم پیشتر کر چکے ہیں۔ اصحاب جمل میں سے کسی صاحب نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، اس لیے بعض علماء نے ان کے باغی قرار دینے میں تامل کیا ہے اور امیر معاویہ کو باغی اول قرار دیا ہے۔ شرح مقاصد میں علامہ تفتازانی لکھتے ہیں ذھب الکثیرون الی ان اول من بغی فی الاسلام معاویہ یعنی اکثر علماء کا یہ مسلک ہے کہ جس شخص نے اسلام میں سب سے اول بغاوت کی ہے وہ معاویہ ہیں۔

(ب) تمام کتب سیر و تواریخ بہ آواز بلند پکار رہے ہیں کہ اصحاب جمل میں سے کسی صاحب نے بالارادہ جناب امیر علیہ السلام سے جنگ نہیں کی، بلکہ جب قاتلانِ عثمان کی فتنہ پردازی سے رات کو لڑائی شروع ہو گئی تو ناچار صحابہ جمل دفاع پر یعنی حفاظت خود اختیاری کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

قال العلامۃ سعد الملۃ والدین التفتازانی فی شرح المقاصد والمحققون من اصحابنا رحمھم ان الحرب الجمل کانت فلتۃ لامن قصد من الفریقین بل کانت تھیجا من قتلۃ عثمان حین صاروا فرقتین واختلطوا بالعسکرین واقاموا الحرب خوفاً من القصاص وقصد عائشۃ لم یکن الا اصلاح الطائفتین وتسکین الفتنۃ فوقعت فی الحرب۔ یعنی ہمارے محقق اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ حرب جمل بلا قصد فریقین ناگہانی طور پر واقع ہو گیا۔ حضرت عثمان کے قاتلوں کی انگیز تھی کہ وہ لوگ دو گروہ بن کر دونوں لشکروں پر جا پڑے اور قصاص کے خوف سے فتنہ اٹھا دیا۔ جناب اُمّ المومنین عائشہ کا قصد دونوں

گروہ میں صلح کرانے اور فتنہ فرو کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن لڑائی میں پھنس گئیں۔

(ج) اصحاب جمل میں سے کوئی خلیفہ وقت سے انتزاع خلافت کا صد نہیں ہوا اور نہ کوئی جناب امیرؑ کی مخالفت پر مصر ہو کر قتل ہوا ہے۔ چنانچہ لڑائی کی رات کو جب ظلمتِ شب مرتفع ہو گئی اور صبح نمودار ہوئی اور جناب طلحہ پر حقیقت حال کا انکشاف ہو گیا فوراً محاربہ سے کنارہ کش ہو گئے اور مروان بن حکم کے ہاتھ سے تیر کھا کر شربت شہادت نوش کیا۔

علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں فرماتے ہیں:

"اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ جناب امیرؑ نے طلحہ کو بلا کر اپنی سابقت اور فضل کو بیان کیا۔ طلحہ لڑائی سے واپس ہو کر زبیر کی طرح سے فوج کی صفوں سے علیحدہ ہو گئے، مروان بن حکم نے تیر مار کر شہید کیا اور علماء ثقات میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا کہ طلحہ کو اُسی دن مروان نے قتل کیا ہے، اور مروان حضرت طلحہ کے گروہ میں سے تھا۔"

عن یحییٰ بن سعید قال قال طلحۃ یوم الجمل:

ندمت ندامۃ الکسعی لما

شریت رضی اللہ بنی جرم برغمی

اللّٰھم خذ منی لعثمان حتی ترضی فرماہ مروان سھم فی رکبتہ۔ (اخرجہ

لہ واقعات سے بالکل آنکھ بند کر کے یہ کہا جا سکتا ہے ورنہ راہ مکہ سے روانگی اور لوگوں کو خط لکھنا وغیرہ عملاً حضرت سے جنگ کے لیے تھا نہ کہ رفع فتنہ کے لیے

ابو عمر وصاحب الاستیعاب و ابن الاثیر فی اسد الغابۃ و محب الطبری فی الریاض، جناب طلحہ کا تجدید بیعت کرنا بھی ثابت ہے چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی "مدارج النبوۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"از ثور بن حجر آمدہ کہ گفت گزشتم بطلحہ بن عبداللہ یوم الجمل دوی افتادہ بود بر زمین در آخر رمق پس ایستادم بروے و برداشت سر خود را و گفت بدرستی ہر آئینہ می بینم روے مردے را کہ گویا قمر است بگو کیستی، گفت از اصحاب امیر المومنین علیؑ گفت فراخ کن دست خود را تا بیعت کنم ترا۔ پس گفت اللہ اکبر اللہ اکبر صدق رسول اللہ صلعم یاد کرد خدا تعالیٰ کہ دارد طلحہ را در بہشت مگر آنکہ بیعت من گردن او باشد۔"

اور جناب زبیر کی نسبت تمام کتب تواریخ بہ آواز بلند شہادت دیتے ہیں کہ جب معرکہ کارزار گرم ہوا جناب امیرؑ نے اُن کو بُلا کر تنبیہ کیا، وہ فوراً اصحاب جمل کا ساتھ چھوڑ کر مدینہ کو چلے گئے اور وادی سباع میں پہونچ کر عمرو بن جرموز کے ہاتھ سے شہید ہوگئے۔

قال ابن عبد البر فی الاستیعاب ثم شهد الزبیر بجمل فقاتل فیه ساعة فناداه علی وانفرد به فذکره ان رسول الله صلعم قال له وقد وجدهما یضحکان بعضهما الیٰ بعض اما انك ستقاتل علیا وانت له ظالم فذکر ذٰلك للزبیر فانصرف عن القتال نادما مفارقا للجماعة التی خرج فیها منصرفا الی المدینة فاتبعه ابن جرموز فقتله بموضع یعرف بوادی السباع وجاء بسیفه

الیٰ علی فقال بشر قاتل بن صفیة بالنار۔ یعنی پھر زبیر فوج سے باہر نکل کر حملہ آور ہوئے، تھوڑی دیر تک لڑتے رہے۔ پھر جناب امیرؑ نے اُن کو بلایا اور تنہائی میں اُن سے جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد یاد دلایا کہ تم نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے ہوئے پاکر پوچھا تھا اور حضرتؐ نے فرمایا تھا کہ تم عنقریب علیؑ سے لڑو گے اور تم ان پر ظلم کرو گے۔ جب جناب امیرؑ نے اُن سے اس کا تذکرہ بیان کیا۔ وہ لڑائی سے نادم ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف روانہ[1] ہو گئے۔ ابن جرموز نے ان کا پیچھا کیا اور وادی سباع میں ان کو شہید کیا اور اُن کی تلوار لے کر جناب امیر کے پاس حاضر ہوا۔ جناب امیرؑ نے فرمایا ابن صفیہ کے قاتل کو دوزخ کی خوشخبری ہو۔

تنبیہ:

صفیہ بنت عبدالمطلب جناب زبیر کی والدہ، جناب امیرؑ کی پھوپھی تھیں اور زبیر آنحضرت صلعم اور جناب امیرؑ کے عمزاد بھائی تھے۔ اسی لیے جناب امیر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے اخواننا بغونا[2] یعنی ہم پر ہمارے بھائیوں نے بغاوت کی ہے۔

اسی طرح سے جناب صدیقہ کا نادم ہونا تمام کتب سیر و رجال سے ظاہر ہے۔ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی الاعتماد فی الاعتقاد میں لکھتے ہیں:

وکذا عائشة ندمت علیٰ ما فعلت وکانت تبکی حتی تبل خمارها

---

[1] مگر علی کا ساتھ نہ دیا۔

[2] اوپر تفتازانی صاحب کی عبارت اول من بغی فی الاسلام معاویہ سے استدلال میں بغاوت معاویہ ثابت ہوئی لیکن علیؑ کے بغونا کہنے سے کچھ ثابت نہ ہوا۔ سبحان اللہ!

شرح فقہ اکبر للملاؔ علی القاری یعنی اس طرح سے جناب صدیقہ اظہار ندامت فرماتی رہیں اور یہاں تک رویا کرتی تھیں کہ اُن کے سر کی اوڑھنی تر ہو جاتی تھی۔ عن جابر قال دخلت علیٰ عائشۃ یومًا وقلت لہا ماتقولین فی علی فاطرقت رأسہا ثم رفعت وقالت:

اذا ما التبر حك على محك — تبين غشه من غير شك

وفينا الغش والذهب المصفى — على بيننا شبه المحك

اخرجه الشیخ حافظ الزرندی فی درالسمطین۔

یہ ایسے واقعات ہیں جن سے کسی نے انکار نہیں کیا کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ امیر معاویہ کا حرب صفین جس کا ٹنٹا ایک مدت مدید تک جاری رہا اور جنگ جمل جس کا خاتمہ ایک ہی روز میں ہو گیا برابر ہے اور جس طرح امیر معاویہ مورد اعتراض ہیں اُسی طرح سے اصحاب جمل بھی ہیں جن کی براءت خود جناب امیرؑ سے مروی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں:

من قد روی عن علی قال واللہ لارجوان اکون انا وعثمان وطلحۃ والزبیر ممّن قال تبارك وتعالیٰ ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علیٰ سرر متقابلین۔ یعنی جناب امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرماتے تھے کہ خدا کی قسم ہے میں امید کرتا ہوں کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر اُن میں سے ہوں گے جن کی نسبت خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے اور نکال ڈالی ہم نے جو اُن کے جیوں میں تھی، خفگی بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے یہ جلیل القدر صحابہ اخص الخواص مہاجر عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور جناب رسول اللہ صلعم کے حواری کہلائے جاتے

ہیں، ان کے فضائل و مناقب متواترات کی حد تک پہونچ چکی ہیں اور جناب امیرؑ کے ہم پلّہ خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کے ماسوا خود جناب امیرؑ نے ان کی برارت کی شہادت دی ہے۔ باوجود ان حالات کے پس کیوں کر ان کی ذوات مقدسہ سے صدور معصیت کا گمان کیا جاسکتا ہے البتہ اُن کا جناب امیرؑ پر خروج کرنا یا نکث بیعت کرنا تو ثابت ہے جس کو خطار فی الاجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں: "و بود طلحہ روز جمل با عائشہ بہ جہت خطا در اجتہاد۔"

لیکن جس طرح سے اُن کا خروج ظاہر ثابت ہے اُسی سے اُن کی توبہ اور ندامت اور رجوع بھی ثابت ہے۔ برخلاف ان امور کے معاویہ بقولے پانچ سال اور بقول ارسال جناب امیر سے جنگ کرتے رہے اور اپنی خطا پر مصر رہے۔ چنانچہ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں:

فحارب معاویۃ علیا خمس سنین وقال ابوعمرو وصوابہ اربع سنین۔ یعنی جناب امیر علیہ السلام سے امیر معاویہ پانچ سال تک لڑتے رہے۔ ابوعمرو کہتے ہیں ٹھیک بات یہ ہے کہ چار سال تک لڑتے رہے بلکہ مخالفت ہی پر مصر نہیں رہے تسخیر بلاد اور دعوی خلافت کو منظور نظر رکھ کر امیر علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے کبیر الروم کو نذر دے کر صلح کر لی۔ اگر معاویہ کو انتزاع خلافت مدّنظر نہیں تھا تو محمد بن ابی بکر جناب امیر علیہ السلام کے عامل سے مصر کو کیوں چھین لیا تھا ——— بعض لوگ بمقابل جناب امیر علیہ السلام کے امیر معاویہ کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہیں اور اُن کے مناقب، اصحاب جمل کے مناقب کے ہم پلّہ ٹھہرائے جاتے ہیں، لیکن اصحاب جمل کے مناقب مشتبہ اور امیر معاویہ کے مناقب غیر مشتبہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حضرت اُمّ المومنین کی عفّت پر قرآن ناطق ہے، حضرت طلحہ و زبیر کے فضائل متواترات سے مُسلّم اور مثبوت ہیں۔ امیر معاویہ کے فضائل و مناقب کا یہ حال ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں: "و گفتہ اند محدثان ثابت نہ شدہ در فضل معاویہ، ہیچ حدیثے"۔

امام ابو عبدالرحمٰن بن شعیب النسائیؒ فرماتے ہیں: "ما اعرف لہ فضیلۃ الا لا اشبع اللہ بطنہ"۔ یعنی امیر معاویہ کی فضیلت بجز اس کے نہیں جانتا کہ حضرت نے فرمایا ہے "خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے"۔ دوسرے مقام پر مقولہ اما یر فی معٰویۃ ان یخرج رأسا برأس زبان پر لاتے ہیں، یعنی معاویہ اس پر راضی نہیں کہ سر بسر نجات پا جائے۔

قال محمد بن اسحاق الاصبهانی سمعت مشایخنا بمصر یقولون ان اباعبدالرحمٰن النسائیؒ فارق مصر فی آخر عمرہٖ وخرج الیٰ دمشق فسئل عن معٰویہ وما روی من فضلہ فقال اما یرضی معٰویہ ان یخرج رأسا برأس حتی یفضل وفی روایۃ ما اعرف لہ فضیلۃ الا لا اشبع اللہ بطنہ۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان و مرآۃ الجنان للامام عبداللہ الیافعی) محمد بن اسحاق اصبہانی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے مشایخوں کی زبان سے سُنا ہے کہ امام ابو عبدالرحمٰن النسائیؒ اپنی آخر عمر میں مصر کو چھوڑ کر دمشق چلے گئے، وہاں کے لوگوں نے امیر معاویہ کے فضائل و مناقب کی نسبت پوچھا۔ امام نسائیؒ نے جواب دیا کہ امیر معاویہ اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ نجات ہی پا جائیں کہ اُن کے فضائل کو بیان کیا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ امام نسائیؒ

نے فرمایا مجھے اُن کی کوئی فضیلت معلوم نہیں سوائے اس کے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلعم بعث لمعاویۃ لیکتب فقیل لہ انہ یاکل فقال صلعم لا اشبع اللہ بطنہ (اخرجہ ابوداؤد الطیالسی) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جناب رسالت مآبؐ نے ایک آدمی کو معاویہ کے بلانے کے لیے بھیجا، وہ آ کر کہنے لگا وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے۔

بعض اشخاص ان کی فضیلت یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کاتب الوحی تھے۔ خیال کرنا چاہیے کہ اگر کتابت وحی سے کسی قسم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے تو وہ مروان بن الحکم کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن امیر معاویہ کے کاتب الوحی ہونے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں:

"واما معاویہ بن ابی سفیان کنیت کردہ می شود بابی عبدالرحمٰن یکے ازاں جملہ است کہ می نوشت برائے آنحضرت صلعم و بعضے گویند نوشت وحی، صاحب جامع الاصول می گوید کتابت نشدہ است در مواہب لدنیہ می گوید وے مشہور راست بر کتابت و بعضے گویند وے نمی نوشت وحی را بلکہ می نوشت کتب ومناشیر را۔"

ماسوائے اس کے جناب عثمان کی فضیلت زیادہ تر جامع القرآن ہونے کی وجہ سے ہے جس کا ثواب ان کو تا بروز قیامت ہوتا رہے گا اور جس قدر کہ دنیا میں لوگ قرآن شریف پڑھنے والے ہیں یا ہوتے چلے آئے ہیں یا ہوتے رہیں گے

ان کے پڑھنے کا ثواب حضرت عثمان جامع القرآن کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا رہے گا۔

چھٹا وہم ۔۔ اگر امیر معاویہ عاصی اور باغی ہوتے تو جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثنار کیوں خلافت اُن کے سپرد فرماتے۔

لیکن یہ وہم بھی بالکل بے جا ہے کیونکہ امامت عامہ کی تفویض ایسے شخص کے ہاتھ میں کرنے سے جو پیشتر باغی رہ چکا ہو اور پھر تائب ہو کر کتاب و سنت اور سیرت شیخین کے اتباع کا عہد کرتا ہو کوئی اعتراض جناب امام حسن علیہ السلام کے غلام کی طرف عائد نہیں ہو سکتا۔ جناب امامؑ نے جو عہد کہ معاویہ سے تفویض امارت کے وقت لیا ہے وہ سابقہ اعمال سے بمنزلہ توبہ کے تصور کیا جا سکتا ہے لیکن جناب امامؑ کی امارت عامہ تفویض کرنے سے امیر معاویہ کا سابقہ امور میں محفوظ عن الخطاء ہونا کسی طرح سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی ٹھیک مثال ایسی ہے کہ ایک گاؤں کے مالک نے غلہ کا انبار مساکین پر خیرات کرنے کے لیے جمع کیا ہو، ایک رہزنوں کا سردار اُسے غارت کرنا چاہے، مالک اس کی حفاظت کے واسطے اس سے جنگ کرے، پھر ایک مدت کے بعد مالک فوت ہو جائے اور اُس کا بیٹا اُن رہزنوں کے سردار سے یہ عہد لے کر وہ غلہ کا انبار اُس کے سپرد کر دے کہ یہ غلہ ہم اس شرط سے تمھارے سپرد کرتے ہیں کہ تم مساکین پر صرف کیا کرو اور اس میں خیانت نہ کرو، اور اس تفویض سے فتنہ و فساد فرو ہو جائے، اور خوں ریزی مٹ جائے تو اُس سے نہ اُس غلہ کے مالک کی نسبت جو ان غارتگروں سے حفاظت غلہ کے لیے جنگ کرتا تھا کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور نہ اُس مالک کے بیٹے پر جس نے یہ عہد لے کر غلہ اُن رہزنوں کے سپرد کیا ہے اور غلہ کی حفاظت سے نہ اپنا ہی پیچھا چھڑایا ہے بلکہ ایک خلق خدا کو ناحق کے کشت و خون سے بچایا ہے

اور نہ ان رہزنوں کا افسر جس زمانہ تک کہ غلّہ اس کی تفویض نہیں ہوا تھا اور وہ اس میں تصرّف کرنا چاہتا تھا اعتراض سے بچ سکتا ہے۔ البتہ اگر اس عہد کے بعد وہ اپنے قول و فعل میں صادق نکلے اور غلّہ کو عہد کے موافق مساکین پر صرف کرتا رہے تو خیال کیا جائے گا کہ اُس نے اپنے اعمال سابقہ سے توبہ کی ہے اور اب اس کو غلّہ میں تصرّف کرنا جائز ہو گیا ہے۔ اگر پھر وہ راہزن یا اس کا جانشین عہد سے انحراف کر کے شرائط کو پورا نہ کرے تو پھر عاصی متصور ہو گا اور اس کے ساتھ اس عہد گیرندہ یا اس کے جانشین پر جہاد واجب ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی بنا پر جناب امام حسین علیہ السلام نے امیر معاویہ کے جانشین یزید پلید کو جب وہ شرب خمر کرنے لگا اور حقوق الناس میں اور حدود اللہ سے تجاوز کر کے بہن اور بھائی کی شادی کا مجوز ٹھیرنے لگا تو متنبہ کرنا چاہا تھا اور حضرت امام علیہ السلام اس خروج میں محق تھے۔ کیونکہ خلافت دراصل انھیں کا حق تھا۔

ساتواں وہم۔ جب امام حسن علیہ السلام خلافت کو ترک کرنا چاہتے تھے تو امیر معاویہ کو تفویض خلافت کے لیے کیوں منتخب کیا تھا اور خلافت کسی دوسرے کو کیوں نہیں سپرد فرمائی تھی۔ جناب امامؑ کے اس انتخاب سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ امیر معاویہ اپنے عہد میں افاضل صحابہ میں سے ہوں گے جن کی وجہ سے جناب امامؑ نے خلافت اُن کے سپرد فرمائی، ورنہ حضرت امامؑ کسی دوسرے کو اس منصب کے لیے منتخب فرماتے۔

یہ وہم بھی عدم تتبع کتب سیر و تواریخ سے ناشی ہوتا ہے کیونکہ جناب امام حسنؑ نے خلع خلافت کے وقت امیر معاویہ کو امارت عامّہ اس وجہ سے سپرد فرمائی تھی، اور

دوسرے کو اس لیے منتخب نہیں کیا تھا کہ بغیر اس کے خوں ریزی کا انسداد محال تھا۔ اگر جناب امام حسنؑ کسی اور صحابی کو امارت سپرد فرماتے تو ضرور امیر معاویہ ان سے وہی معاملہ کرتے جو جناب امیر علیہ السلام سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ خلافت راشدہ کا زمانہ منقضی ہو چکا تھا اب مملکت عضوضہ کی عہد کی صبح نمودار ہونے والی تھی بجز امیر معاویہ کے اور کوئی صحابی اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بفحوائے اعط القوس باریہا جناب امامؑ نے امیر معاویہ ہی کو اس منصب کے لیے لائق سمجھا اور جس امر کے لیے وہ برسوں سے کشت و خون کر رہے تھے اُن کے حسب منشا انھیں سپرد کیا۔ اب رہا یہ امر کہ معاویہ تفویض امارت کے بعد بھی امام ہوئے ان کی نسبت اہلسنت والجماعت میں باہم اختلاف ہے۔ فخر الاسلام حسن بزدوی لکھتے ہیں:

امابعد موت علی هل صار اماما وقال بعضهم لم یصر امامانه لم یکن افضل[۱] الصحابة بعد علیؑ بل کان من الصحابة یومئذ هوا فضل منه بکثیر فی النسب والعلم والتقوی والشجاعة ولان احدا من الصحابة لم یره امام حق ولم یعقد له عقد الامامة ومعٰویة ما کان من جملة الخلفاء ولکن کان من جملة الملوک۔ یعنی جناب امیر علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی امیر معاویہ امام ہوئے ہیں یا نہیں؟ بعض اہلسنت والجماعت کہتے ہیں کہ نہیں ہوئے۔ لیکن ان لوگوں کے قول کی وجہ کہ جو کہتے ہیں کہ امام نہیں ہوئے یہ ہے کہ امیر معاویہ جناب امیر علیہ السلام کی وفات کے

[۱] یہ عجیب بات ہے کہ جب علیؑ کی افضلیت یا امام کا افضل ناس ہونا پیش کیا جاتا ہے تو وہاں اجماع یا شوریٰ کو دیکھا جاتا ہے۔ یہاں پر امامت کی صلاحیت نہ ہونے کا سبب مفضولیت قرار دیجاتی ہے۔

بعد اُس وقت کے موجودہ اصحاب سے افضل نہیں تھے بلکہ اُس وقت اکثر ایسے اصحاب موجود تھے جو نسب اور علم اور شجاعت اور تقویٰ میں امیر معاویہ سے بدرجہا افضل تھے اور امیر معاویہ خلفاء میں سے نہیں تھے بلکہ بادشاہوں میں سے تھے۔ اسی لیے کسی صحابی نے ان کو امام نہیں روایت کیا اور ان پر امامت کا عقد نہیں ہوا۔ اسی واسطے اہل علم امیر معاویہ کو خلفاء میں سے نہیں شمار کرتے بلکہ ملوک میں سمجھتے چلے آئے ہیں۔ تاریخ الخلفاء میں علامہ جلال الدین السیوطی ابن ابی شیبہ کی کتاب مصنف سے نقل کرتے ہیں:

عن سعید بن جمهان قال قلت لسفینة ان بنی امیة یزعمون ان الخلافة منهم قال کذب بنوا الزرقاء بل هم ملوك اشد الملوك واول الملوك معاویة۔ یعنی سعید بن جمہان کہتے ہیں میں نے سفینہ سے پوچھا کہ بنی امیہ اپنے آپ کو خلفاء جانتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یہ گنجی عورت کے جنے جھوٹ بکتے ہیں یہ لوگ سخت ترین بادشاہوں میں سے ہیں اور اُن میں سے پہلا بادشاہ معاویہ ہے۔

فخر الاسلام بزدوی المیسر میں لکھتے ہیں:

ومعاویة ما کان من جملة الخلفاء ولکن کان من جملة الملوك علی ما روینا عن النبی صلعم انه قال الخلافة بعدی ثلثون سنة ثم بعده ملك عضوض وقد تم ثلثون سنة بعلی۔ یعنی معاویہ خلفاء میں سے نہیں تھے بلکہ ملوک میں سے تھے بدلیل اس حدیث کے کہ جناب رسولؐ نے فرمایا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس۳۰ برس تک

رہے گی، پھر ایک درندہ شاہی ہو گی اور تینتیس برس جناب امیر علیہ السلام تک پورے ہو چکے تھے۔

آٹھواں وہم ۔ سواد اعظم اہل سنت والجماعت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ امیر معاویہ کی خطا، خطا فی الاجتہاد ہے اور وہ اس میں معذور بلکہ ماجور اور مثاب تھے۔ اس کے برخلاف خطائے منکر کا قائل ہونا اور ان کو باغی اور عاصی قرار دینا خارق سواد اعظم بننا ہے اور من شذ شذ فی النار کے زمرہ میں داخل ہونا ہے۔ یہ ایک بڑی بھاری دلیل ہے جو اہل صفین کی برارت پر پیش کی جاتی ہے لیکن اس میں بوجوہ متعددہ نظر ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہی دلیل امیر معاویہ اور ان کے متبعین پر منقلب ہوتی ہے کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کا انعقاد اہل حل وعقد کے اتفاق سے ہوا ہے اور جناب امیرؑ نے اہل صفین کے مقابلہ میں اسی دلیل کو پیش بھی کیا تھا۔ امیر معاویہ کی شرکت میں چند صحابہ جن کی تعداد جمع قلت سے تجاوز نہیں کرتی۔ اہل شام کے نو مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ جن کے امور دین میں ماہر ہونے کی نسبت مسعودی علیہ الرحمہ نے مروج الذہب میں ایک مضحکہ کی حکایت لکھی ہے:

"اہل علم بھائیوں میں سے ایک شخص ذکر کرتا ہے کہ ہم دمشق الشام میں جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ کی نسبت بحث کیا کرتے تھے۔ عوام الناس شامی ہماری گفتگو سنا کرتے تھے۔ ایک روز اُن میں سے ایک لانبی داڑھی والا جو اُن میں نہایت عقلمند سمجھا جاتا تھا آ کر ہم سے کہنے لگا کب تک تم علیؑ اور معاویہ کے جھگڑے کو طول دو گے۔ میں نے کہا تیری اس میں کیا رائے ہے؟ کہنے لگا تو کس کی نسبت پوچھتا ہے؟ میں نے کہا علیؑ کی نسبت۔ کہنے لگا وہی

علیؑ جو فاطمہؑ کے باپ تھے۔ میں نے کہا فاطمہؑ کون تھیں ؟ کہنے لگا حضرت صلعم کی بی بی عائشہ کی بیٹی معاویہ کی بہن۔ میں نے کہا اچھا یہ تو بتا کہ علیؑ کا کیا قصہ ہے ؟ وہ بولا غزوہ حنین میں آنحضرتؐ کے ساتھ جنگ کیا تھا"

اس سواد اعظم کے خارق متصور نہیں کیے جاتے کہ جس پر تمام افاضل صحابہ اور مہاجرین وانصار اہل حلّ وعقد کا اجماع ہو چکا تھا۔ پس وہ اہل سنت والجماعت کا گروہ جو امیر معاویہ کے خطائے منکر کے قائل ہیں کیونکہ سواد اعظم کے خارق تصوّر کیے جا سکتے ہیں، جب کہ اہل صفین کے دامن پر صحابۂ کرام اہلبیت عظام وانصار مدینہ کے سواد اعظم (کہ محققین اہل سنّت کے نزدیک اجماع دراصل انھیں کے اتفاق رائے سے مراد ہے) کی مخالفت سے کسی قسم کا دھبہ نہیں لگتا۔ پس اگر کوئی شخص بعض کتب مشہورہ کے برخلاف اہل صفین کی معذوری کو نہ تسلیم کرے اور بقول مولانا جامی :

اختلافے کہ داشت با حیدر   در خلافت صحابیٔ دیگر
حق در آنجا بدست حیدر بود   جنگ با او خطائے منکر بود

کا قائل ہو تو اُس کو کیوں خارق اجماع کہا جا سکتا ہے۔

(ب) یہ حجّت خطابیات کی قسم سے ہے نہ برہانیات سے، ایسے دلائل اقناعیات پر اکتفا کر لینا اتیان حجت سے عجز کی دلیل ہے اس سے مخالفین کی زبان طعنہ کشادہ ہوتی ہے۔ اہلسنّت والجماعت کے مخالف کہہ سکتے ہیں کہ جب ان لوگوں کے ایسے دعوے بے دلیل اور امر خلاف بداہت پر اتفاق کر لیا ہے تو ان کے دوسرے دلائل اور مقدمات مسلّمہ بھی اسی قبیل سے ہوں گے۔ اگر اتباع سواد اعظم سے مراد صرف اتباع کثرت آرا ہے تو یہ بات ہرگز قابل تسلیم نہیں ورنہ حنبلی المذہب جن کی جماعت

بمقابلہ احناف کے نہایت قلت کے ساتھ اسلامی دنیا میں آباد ہے۔ من شذ شذ فی النار کے مورد سمجھے جائیں گے۔ سواد اعظم سے اجماع امت مراد ہے۔ اس مبحث میں چند علمار کے اقوال نقل کرنے سے اجماع ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اگر تلاش کیا جائے تو صحابہ کی جماعت سے کسی صاحب کا پتہ نہیں ملتا کہ اس اہل صفین کی برارت پر کسی قسم کا اشارہ بھی کیا ہو بلکہ جناب امیرؑ کے ساتھ سب صحابۂ کرام کی شرکت اور اہل صفین کے مقاتلہ کرنے سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ سب بزرگوار خلیفۂ وقت کے ساتھ اُن کی مخالفت کو بغاوت اور اس بغاوت کو عصیان سمجھتے تھے اور اُن کے ساتھ جنگ کرنا واجب جانتے تھے۔ اس کے ماسوا حضرت عمار یاسر کی شہادت نے ان کو مخبر صادق صلعم کا قول یا عمار تقتلك الفئة الباغیة یاد دلایا تھا۔ جس سے یقیناً وہ اہل صفین کو خاطی، باغی، عاصی سمجھتے تھے اور ان کو ایسا سمجھنے میں بمعیت امام وقت انھوں نے اجماع کرلیا تھا اور ان کا اجماع تقتلك الفئة الباغیة سے منصوص تھا۔

(اقول) صاحب ارجح المطالب کی عبارت کو عربی، فارسی، اردو لفظ بہ لفظ باوجود طویل ہونے کے اس لیے نقل کر دیا گیا کہ اس میں امام حسن علیہ السلام کی صلح کی تحسین و توجیہ کے علاوہ دیگر فوائد بھی ہیں علی الخصوص معاویہ کے اعمال و افعال پر اور اُن سے جس طرح اور جن وجوہ سے اہل سنّت علمار کو اشتباہ میں دانستہ یا نادانستہ واقع ہو جانا پڑا ہے کافی روشنی پڑتی ہے اور جو لوگ یزید اور معاویہ میں فرق نہیں کرکے امام حسن علیہ السلام کے لیے بھی امام حسین علیہ السلام کی طرح جنگ کرنا یکساں سمجھتے ہیں ان کا جواب خود بخود ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے امام حسنؑ

کو ایسی پالیسی والے شخص سے سابقہ پڑا ہے جس کے لیے صاحب ارجح المطالب باوجود غلطی اور بغاوت وغیرہ ثابت کرنے کے الفاظ بد کے استعمال کو ممنوع قرار دیتے اور اُس کے لیے الفاظ تعظیمی استعمال کرتے ہیں۔ تو جو معاویہ کو صحت پر اور معذور و ماجور کہتے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ بخلاف اس کے امام حسینؑ کا مقابلہ اُس پالیسی کے شخص سے ہوا تھا جسے کوئی آدمی کہنے کو تیار نہیں۔ اپنی اس طویل عبارت کے نیچے صاحب ارجح المطالب نے بعنوان "احادیث متعلق شہادت عمار یاسر رضی اللہ عنہ" سترہ روایتیں نقل کر کے لکھتے ہیں:

قال الامام ابو المعالی فی الارشاد حدیث تقتلك الفئة الباغیة ھو من اثبت الاخبار۔ (امام ابو المعالی کتاب ارشاد میں لکھتے ہیں کہ حدیث تقتلك الفئة الباغیة نہایت ثابت شدہ احادیث میں سے ہے۔)

صاحب ارجح المطالب کی عبارت منقولہ میں شیعہ نقطۂ نگاہ سے بے شمار قابلِ مواخذہ مقامات ہیں، بعض جگہ ہلکا سا تعرض بھی کر دیا گیا ہے پھر بھی بہت سے قابلِ اعتراض امور باقی رہ گئے ہیں۔ چونکہ مقصود صرف اپنی تائید میں مخالف کی رائے پیش کرنا تھا اس لیے سب کو نقل کر دیا ہے۔ اب اس حد تک پہونچ کر مجھے کامل یقین ہے کہ کسی شیعہ کو بہ حیثیت شیعہ ہونے کے امام حسن علیہ السلام کی صلح کے متعلق کوئی شبہ باقی نہ رہ سکے گا۔ کیونکہ شیعوں کے علاوہ اہل سنت کی کتابوں سے بھی وجوہ و حالات پر کافی روشنی پڑ چکی جس سے امام حسنؑ کی روش پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا، اور جب اہل سنت اور خصوصاً وہ جو باوجود اسلام و مسلمین کے ساتھ اُس سلوک کے جس کا ذکر ہوا اور امام حسنؑ کے ساتھ باوجود اُس سلوک کے جس کا ذکر ہوا امام حسنؑ کی صلح

کو صحیح اور ان کی اس روش کو درست اور ناقابلِ اعتراض سمجھتے ہیں تو شیعہ کو اعتراض کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی۔

یہاں سے اب کتاب کا دوسرا جزو شروع ہوتا ہے یعنی غیر شیعہ مسلمان کے نزدیک بھی یہی صحیح اور درست تھا جو امام حسنؑ نے کیا، یعنی آپ کو جنگ روک دینا ہی درست تھا اور صلح کرنا ہی مناسب تھا۔ صرف یہ خلش رفع کرنے کی ضرورت رہتی ہے اور دراصل یہی خلش ایسی ہے جس نے مسلمان، غیر مسلمان، شیعہ، سُنّی سب کو اُلجھایا ہے۔ وہ خلش یہ ہے کہ اگرچہ صلح کرنا غلط نہ تھا، صحیح تھا۔ مگر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے اس طرح کی صلح کر کے معاویہ کو خلیفۃ اللہ بنایا یا مانا؟ اور وہ منصب خلافت الٰہیہ کا مالک ہو گیا؟ اور آیا اس طرح امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو اس کے افعال کو درست اور واجب الاتباع شرعی سمجھ لیا؟ اور آیا امام حسن علیہ السلام امام برحق اور خلیفۃ اللہ نہ رہے؟ اور آیا لڑ کر مر جاتے تو یہ بات باقی نہ رہتی؟ یا ایسا نہیں ہے۔ اور سب کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہ معاویہ کی حقیت ثابت ہوتی ہے نہ معاذ اللہ امام حسنؑ کی امامت و خلافتِ الٰہیہ جاتی رہے نہ شیعہ عقائد کی رو سے نہ سُنّی خیالات کی رو سے، چونکہ اہلسنت کی طرف سے بعض نافہم یا متعصب لوگوں نے معاویہ کو برحق بنانے کی سعی کی ہے جو قطعی غلط ہے جس کی توضیح آیا چاہتی ہے، اس بنا پر شیعوں کو بھی غصہ آتا ہے اور سُنّی بھی غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں اور غیر مسلم بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔

بہر حال اب ہم اہلسنت کی کتابوں سے امام حسنؑ کی صلح کے متعلق اپنے دعوے کی دلیلیں نقل کرتے ہیں۔

نے یہ بیان کیا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد خلافت حسنؑ بن علی علیہما السلام کے ساتھ ساتھ تیس سال ختم ہو گئے۔ یہ حدیث اس بات پر صراحتہً دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خلافت اتنی ہی مدت تک حق تھی، اس کے بعد نہیں۔ بلکہ اس کے بعد ملک عضوض ہو گیا۔ ابن حجر ہیثمی نے صواعق محرقہ میں خلافت ابی بکر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یعنی لوگوں کو اس زمانہ (ملک عضوض) میں ظلم اور بے انصافی سے سابقہ پڑے گا۔ گویا وہ ایک دوسرے کو کاٹ کھاتے ہوں گے۔ صاحب صواعق سے تعجب ہے کہ کتاب کے شروع میں تو حق بات کا اعتراف کیا اور خاتمہ کتاب میں اپنی ہی مخالفت اس طرح کی کہ معاویہ کو خلیفہ حق اور امام صدق کہہ دیا۔ دراصل فراموشی اور نسیان ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے سعید بن جہان سے روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ میں نے سفینہ سے کہا کہ بنی امیہ اسی زعم میں ہیں کہ خلافت ان میں ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ کرنجی آنکھ والے کے جنے جھوٹے ہیں۔ (خلافت سے کیا واسطہ) وہ لوگ بادشاہ ہیں اور بادشاہ بھی نہایت بُرے۔ اور معاویہ سب سے پہلا بادشاہ ہے۔ اور ابن سعید نے عبدالرحمٰن بن ابزی سے انھوں نے عمر سے روایت کی ہے کہ عمر نے کہا ہے کہ جب تک اہلِ بدر میں کا کوئی بھی باقی رہے گا یہ اُمر اُو نہیں (بدر والوں) میں رہے گا۔ اس کے بعد اہل احد میں جب تک ان میں کا ایک بھی باقی رہے۔ پھر فلاں پھر فلاں میں لیکن طلیق اور اولادِ طلیق اور مسلمانانِ فتح میں کسی کو اس میں کچھ حق نہیں، کیا اس کے باوجود بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاویہ خلیفہ حق

اور امام صدق ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بھلا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ملک عضوض اور شر ملوک تو جھوٹا ہو جائے اور معاویہ کے ہوا خواہ اپنے قول خلیفہ حق و امام صدق میں سچے بن جائیں۔ کیا لوگوں سے کتاب کا میثاق نہیں لیا جا چکا ہے کہ وہ لوگ خدا کے مقابلہ میں سوائے حق کے اور کچھ نہیں کہیں گے۔ خدایا! ہم ایسے اعمال سے بیزار ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ جو کچھ تیرا نبی اور رسول لایا ہے اس کی تصدیق پر ثابت قدم رہیں۔ بعض جھگڑالو لوگوں نے اس طرح انکار کیا ہے کہ حکم واحد کی نسبت حق و باطل کی طرف نہیں دی جا سکتی۔ حالانکہ دونوں باتیں (امام کا حق پر، معاویہ کا باطل پر ہونا) متضاد ہیں۔ لیکن اس غبی کو اتنا بھی پتہ نہ چلا کہ دو نسبتیں ہیں تو ضرور مگر جہتیں بدلی ہوئی ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا خرابی ہے؟ اس کی نظیریں تو بہت کثرت سے اس شخص کو مل سکتی ہیں جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے کچھ بھی مس ہوگا۔ دیکھ لو آپ نے کفار مکہ سے حدیبیہ کے دن ان شروط پر صلح کر لی کہ آپ اور آپ کے اصحاب نہ حج کریں گے نہ عمرہ بجا لائیں گے اور مدینہ لوٹ جائیں گے۔ اور اگر کفار میں کا کوئی مسلمان ہو کر آپ کی طرف آجائے گا تو اس کو واپس کر دیں اور آئندہ سال بھی جب مکہ میں آئیں گے تو تین دن سے زیادہ نہ رہ سکیں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ (اسلحہ جنگ ساتھ نہ ہوں گے) صرف وہ سلاح جو مسافروں کے لیے ضروری ہوتے ہیں لا سکیں گے (یعنی نیام کے اندر تلوار) ان تمام باتوں کے باوجود وہ (کفار) اس پر بھی راضی نہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ کی لفظ لکھی جائے۔ چنانچہ آپ نے خود اپنے دست مبارک

سے اس لفظ کو مٹا دیا اور اس کو بدل کر محمدؐ بن عبداللہ بنا دیا گیا، تو کیا صلح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حق اور کفار کی طرف سے باطل نہ تھی۔ (ایک جہت سے حق، دوسری جہت سے باطل ہونا معلوم ہو گیا کہ اب بھی نہیں) اسی طرح کیا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیینہ اور اقرع سے اس شرط پر صلح نہیں کی تھی کہ اگر یہ دونوں قبیلے واپس چلے جائیں اور ابوسفیان کی اور احزاب کی مدد نہ کریں تو آپ ان لوگوں کو مدینہ کے پھلوں میں سے ایک تہائی دے دیں گے۔ وہ تو سعد نے آپ کو یہ مشورہ دے دیا کہ یا حضرت اگر وحی سے یہ کام ہو رہا ہو تو خیر ورنہ اس صلح کو پختہ نہ فرمائیے۔ اس رائے کو پسند فرما کر آپ نے اس کو پختہ نہ کیا۔ (کیوں صاحب) کیا یہ صلح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حق اور دوسری طرف سے باطل نہ تھی (جب فعل رسول کی نظیریں موجود ہیں) تو اسی طرح صلح حسن علیہ السلام بھی آپ کی طرف سے حق اور معاویہ کی طرف سے باطل ثابت ہو گئی۔ الغرض معاویہ کے خطا کار، غاصب اور گنہگار ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ اس پر مزید طرّہ یہ کہ معاویہ نے اس صلح میں جن باتوں پر خدا سے عہد کیا تھا ان میں کی اکثر کو توڑ ڈالا، اور خلاف ورزی کی جو آئندہ بیان سے تم پر واضح ہو جائے گا۔ گویا اُس نے خداوند عالم کا یہ قول سُنا ہی نہیں کہ چوں کہ ان لوگوں نے عہد توڑ ڈالے لہذا ہم نے ان پر لعنت بھی کی اور ان کے دلوں کو سخت بھی کر دیا۔ معاویہ نے خداوند عالم کے اس حکم کی کوئی پروا نہ کی کہ جو لوگ میثاق کے بعد عہد خدا کو توڑتے اور جن باتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور زمین

پر فساد پھیلاتے ہیں ان پر لعنت اور ان کے لیے بُرا ٹھکانا ہے۔

اب میں فتح الباری شرح صحیح بخاری اور تاریخ ابوجعفر طبری اور تاریخ کامل ابن اثیر وغیرہ سے صلح کے قصہ کا خلاصہ لکھتا ہوں تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ امام حسن علیہ السلام کو صلح کی کیا مجبوری ہوئی اور معاویہ کے عہد شکنی کا بھی علم ہو جائے۔ ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب لوگوں پر وہ باتیں ظاہر ہو گئیں جو امیرالمومنین علی علیہ السّلام اہل شام کے متعلق ان لوگوں سے بیان کرتے تھے تو چالیس ہزار آدمیوں نے موت پر آپ کی بیعت کی۔ ابھی آپ (مقابلہ کے لیے) جانے کا سامان ہی کر رہے تھے کہ آپ کو قتل کر ڈالا گیا۔ واذا اراد اللّٰہ شیئاً فلا مرد لہ آپ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے امام حسن علیہ السّلام کی بیعت کی تو آپ کو یہ اطلاع پہونچی کہ معاویہ اہل شام کو لے کر آپ کی طرف چڑھا آرہا ہے فوراً آپ نے اسی فوج کو لے کر (جنھوں نے آپ کے والد کی بیعت کی تھی اور کوفہ سے معاویہ کے مقابلہ کے لیے چلے تھے) جنگ کی تیاری کر دی اور بارہ ہزار آدمیوں کا سردار بنا کر قیس بن سعد بن عبادہ کو بطور مقدمۃ الجیش معیّن کر دیا۔ جب امام حسنؑ مدائن پہونچے تو کسی نے آپ کے لشکر میں یہ آواز بلند کر دی کہ قیس بن سعد قتل کر ڈالے گئے بھاگ چلو۔ چنانچہ لوگ بھاگنے لگے۔ چنانچہ آپ کے (خیمہ کے) پردہ لے بھاگے، آپ کا اسباب لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ جس فرش پر آپ بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی کھینچ لے گئے اور خود آپ کے شکم مبارک پر خنجر کا وار کر دیا۔ آپ کو لامحالہ ان لوگوں سے نفرت ہو گئی اور ان کے خطرے محسوس کرنے

لگے اور آخر کار مدائن کے سفید قصر میں داخل ہو گئے۔ اس وقت مدائن کے حاکم سعد بن مسعود ثقفی تھے جو مختار بن عبیدہ کے چچا تھے۔ اس وقت مختار جو ابھی نوجوان تھے کہنے لگے کہ (چچا) آپ کو دولت اور شرف کی خواہش ہے انھوں نے پوچھا کیا مطلب؟ انھوں نے کہا حسنؑ کو قبضہ میں کر کے معاویہ کے حوالے کر دیجئے۔ اس پر ان کے چچا نے کہا کہ بھلا نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کر دوں اور انھیں گرفتار کر دوں تم تو بہت بُرے آدمی ہو۔ اب امام حسنؑ کو یقین ہو گیا کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی غالب نہیں ہو سکتا، مگر جب کہ جب زیادہ حصہ قتل ہو جائے۔ آپ نے معاویہ کو لکھا کہ آپ معاویہ کو حکومت حوالے کر سکتے ہیں، بشرطیکہ جو شرطیں آپ کریں اُسے منظور کرے۔ اس پر بعض شرائط میں کچھ دیر سوچ کر سب پر معاویہ راضی ہو گیا۔ اس کے بعد دونوں میں اس طرح صلح طے پائی کہ معاویہ کو مسلمانوں کی حکومت اس شرط سے حوالہ کی جاتی ہے کہ وہ کتاب[1] خدا، سُنّتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین مہدیئین کی سیرت کے مطابق حکومت کرے۔ معاویہ[2] کو یہ حق نہیں کہ اپنے بعد کسی کو اپنا نائب مقرر کرے بلکہ معاویہ کے بعد حکومت کا فیصلہ مسلمانوں کے مشورہ پر موقوف رکھا جائے۔ تمام[3] لوگ خواہ شام میں ہوں، یمن میں ہوں، خواہ عراق میں ہوں، حجاز میں ہوں، زمین خدا پر جہاں ہوں ہر جگہ محفوظ رہیں۔ اصحاب[4] علیؑ اور آپ کے شیعہ کی جان، مال، اولاد، عورتیں جہاں ہوں محفوظ و مطمئن رہیں گے۔ جو کچھ علیؑ کے زمانے میں ہوا ہے ان میں سے کسی کا مواخذہ ان میں کسی سے نہ ہو گا۔ حسنؑ[5] بن علیؑ اور ان کے

بھائی حسینؑ بن علیؑ اور اہلبیتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم میں سے کسی کے قتل کی کوئی سازش مخفی یا ظاہر کسی طور سے نہ کی جائے۔ ان میں کا کوئی چاہے کسی افق پر بستا ہو خوف زدہ نہ کیا جائے۔ معاویہ ان تمام باتوں کا عہد اور میثاق خداوند عالم سے کرتا ہے اور خدا کی گواہی بس ہے۔ ان باتوں سے ابن اثیر نے اتنا اور زیادہ لکھا ہے کہ معاویہ امام حسنؑ کو وہ رقم جو کوفہ کے بیت المال میں ہے اور خراج دارابجرد[1] حوالہ کر دے گا تاکہ اس مال سے ان لوگوں کو راضی رکھا جا سکے جنھیں مال کے سوا اور کوئی چیز راضی نہیں رکھ سکتی، اور یہ کہ علیؑ پر سبّ و شتم نہ کیا جائے گا۔ ان سب باتوں پر معاویہ راضی ہو گیا صرف دو باتیں نہیں مانتا تھا۔ ایک تو علی کو برا کہنا، اس میں اتنا مانتا تھا کہ حسنؑ کے سنتے ہوئے شتم نہ کرے گا۔ اور دوسرے یہ کہ دس آدمیوں کو امن نہ ہوگا۔ اس پر امام حسنؑ نے رضامندی نہ دی بلکہ اپنی شرط پر اصرار ہی کیا۔ معاویہ نے آپ کی طرف یہ لکھ بھیجا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں جب بھی قیس بن سعد پر قبضہ پاؤں گا ان کی زبان اور ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔ اس پر امام حسنؑ نے یہ فرمایا کہ میں تجھ سے ہرگز معاملہ نہ کروں گا' اگر تو قیس یا ان کے علاوہ کسی سے بھی کسی چھوٹی یا بڑی بات کا بدلہ لینا چاہے گا۔ اس پر معاویہ نے ایک سفید کاغذ بھجوا دیا اور کہلا بھیجا کہ اس پر آپ جو چاہیں لکھ دیں میں سب کا پابند ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد معاویہ نے اس پر عہد

---

[1] جو فارسی میں ہے۔

پر مال خرچ کرنا، وقت[۲] پر فوج کشی کرنا، دشمن[۳] کے گھر پر چڑھ کر جنگ کرنا۔ کیونکہ اگر دشمن سے اس طرح تم نہ لڑو گے تو وہ تم سے لڑے گا۔ یہ کہہ کر منبر سے اُتر آیا۔ اور ابو اسحاق سبیعی نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ معاویہ نے خطبہ میں یہ الفاظ بھی کہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ جو کچھ میں نے حسنؑ سے وعدے کیے ہیں وہ سب میرے ان دونوں پاؤں کے نیچے (ان کو روندتا ہوں) کسی ایک کی بھی وفا نہ کروں گا۔ اور عبد الرحمٰن بن شریک جب اس بات کو بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ خدا کی قسم اِس کو تہتک کہتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ جب صلح ہو چکی اور اہلِ کوفہ بیعت کر چکے تو معاویہ نے امام حسنؑ سے التماس کی کہ مجمع میں تقریر کریں اور لوگوں سے یہ کہیں کہ آپ نے معاویہ کی بیعت کر لی ہے اور حکومت اس کے سپرد کر دی ہے۔ آپ نے منبر پر جانا منظور فرمایا اور بالائے منبر جا کر پہلے حمد و ثنائے الٰہی بجا لائے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر صلوات بھیجی اور فرمایا کہ ایہا الناس سب سے زیادہ عقل والا وہ ہے جو خدا سے ڈرے، اور نہایت احمق وہ ہے جو اس کی نافرمانی کرے۔ (کہتے کہتے یہ فرمایا) کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ خداوند عالم نے تمہاری ہدایت میرے جدّ (بزرگوار) کے ذریعہ سے فرمائی اور تم کو گمراہی سے انھیں کے ذریعہ بچایا اور جہالت سے چھڑایا، ذلّت کے بعد انھیں کے طفیل سے تم کو عزت دی اور قلت کے بعد تم کو کثرت انھیں کے سبب سے حاصل ہوئی۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ معاویہ نے مجھ سے اس میں نزاع کی جو بالکل میرا ہے، اس کا اس میں کچھ حصّہ نہیں۔ تو

میں نے اصلاحِ اُمّت اور رفع فتنہ کا خیال کیا۔ اور تم لوگ مجھ سے اس شرط پر بیعت کر چکے تھے کہ جس سے میں صلح کروں گا تم بھی صلح کرو گے، جس سے میں جنگ کروں گا تم بھی جنگ کرو گے۔ اب میری رائے یہ ہوئی کہ معاویہ سے صلح کر لوں اور میری اس کی جو لڑائی ہو رہی ہے اُسے موقوف کر دوں۔ چنانچہ میں نے اس سے معاہدہ کر لیا ہے اور طے کر لیا ہے کہ خوں ریزی کی بہ نسبت خون کو محفوظ کرنا بہتر ہے۔ میرا ارادہ اس سے صرف تم لوگوں کی بھلائی اور تمھاری بقا ہے۔ وان ادری لعلہ فتنۃ لکم ومتاع الیٰ حین۔ اور امام حسنؑ نے قیس بن سعد کے پاس جو آپ کے مقدمۃ الجیش پر بارہ ہزار پر سردار تھے، یہ لکھا کہ معاویہ کی طاعت میں داخل ہو جائیں۔ اس پر قیس لوگوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ ایہا الناس! یا تو گمراہی کے امام کی اطاعت کر لو یا پھر بغیر امام کے ہو کر جنگ کرو۔ چنانچہ بعض لوگ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم گمراہ امام کے ماتحت رہنے کو پسند کرتے ہیں۔

— چنانچہ ان لوگوں نے بھی معاویہ کی بیعت کر لی، اور جن لوگوں نے قیس کا ساتھ دیا ان کے ساتھ قیس لوٹے اور اُن کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ معاویہ سے لڑیں گے یہاں تک کہ معاویہ علیؑ کے شیعوں اور قیس کے کل ساتھیوں کے جان و مال کی حفاظت کی شرط مان لے۔ چنانچہ معاویہ نے ان لوگوں سے اس کا عہد کیا اس طرح آپس میں صلح ہو گئی۔ جب معاویہ کی صلح کا معاملہ مکمل ہو چکا تو اس کے پاس سعد بن ابی وقاص

آئے اور کہا کہ اے بادشاہ! السلام علیک، اس پر معاویہ ہنس دیا اور کہا کہ اے ابو اسحاق! اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا۔ اس پر سعد نے کہا کہ کیا تم مذاق سے نہیں بلکہ واقعتاً کہہ رہے ہو؟ خدا کی قسم جس طرح تم نے حکومت حاصل کی ہے میں تو اس طرح ہونا کبھی پسند نہ کرتا۔ اور مغیرہ بن شعبہ کو یہ اطلاع ملی کہ معین بن عبداللہ خروج کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے کچھ لوگوں کو بھیجا تو اس کے پاس کچھ لوگ موجود تھے۔ بہرحال (معین) گرفتار کر لیا گیا اور قید کر دیا گیا۔ اب مغیرہ نے معاویہ کے پاس اپنا حال کہلا بھیجا۔ معاویہ نے لکھا کہ اگر وہ یہ شہادت دے کہ میں خلیفہ ہوں تو چھوڑ دے۔ مغیرہ نے اس کو حاضر کیا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ معاویہ، خلیفہ اور امیر المومنین ہے؟ معین نے کہا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خداوند عالم برحق ہے اور قیامت کا دن حق ہے، وہ آکے رہے گی، اور یہ بھی حق ہے کہ خدا ان لوگوں کو زندہ کرے گا جو مر چکے ہیں۔ اس پر مغیرہ نے حکم دیا اور معین قتل کر ڈالے گئے (کامل کی عبارت ختم ہوئی)۔ اور ابن عبدالبر نے ابو بکرہ سے روایت کی ہے اس نے بیان کیا کہ میں اپنے باپ کے ساتھ معاویہ کے پاس گیا۔ چونکہ ہم کو اہالیان زیاد نے بھیجا تھا، جب ہم وہاں پہنچے تو معاویہ نے کہا کہ اے ابو بکرہ! کوئی حدیث بیان کرو۔ تو انھوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ فرماتے تھے، خلافت تیس سال ہوگی، پھر ملک ہو جائے گا۔ یہ سُنتے ہی ہمارے متعلق معاویہ نے (نکال دینے کا) حکم دیا۔ چنانچہ ہماری پُشت پر زخم لگا کر ہم کو باہر نکلوا دیا گیا۔

معاویہ اور امام حسنؑ کی صلح کا یہ خلاصہ ہے۔ اس سے اچھی طرح آشکار ہے کہ معاویہ گمراہی کا امام ہے جیسا کہ قیس بن سعد نے کہا، اور یہ بھی متیقن ہو گیا کہ معاویہ بادشاہ تھا اور نہایت بُرا بادشاہ، جیسا کہ سعد و سفینہ نے کہا۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہ رہا کہ معاویہ بدعتی تھا اور بزور شمشیر (حکومت کا) غاصب تھا۔ اس نے رضامندی اور مشاورت سے ہرگز حکومت حاصل نہ کی کہ حق ہوتی، بلکہ وہ تو شتم علیؑ کو حلال اور قیس کی زبان کاٹنے اور فلاں، فلاں کے قتل کے بغیر صلح تک منظور نہیں کر رہا تھا، اس کے علاوہ اس کے بعد اس نے کتنی بدعتیں کیں، دین میں کتنے تغیّر و تبدل کیے اور یہ کل باتیں خدا کے نزدیک ناپسندیدہ گناہ تھیں۔ اب (کوئی بتلائے کہ) کہاں ہے وہ حقیقت جس کا ادّعا معاویہ کے انصار کرتے ہیں جن کی غرض سوائے اپنی رائے کی تائید اور اپنی ٹولی کی بے جا طرف داری کے سوا کچھ نہیں۔ کاش یہ لوگ للّٰہ سچ کہتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ خداوند عالم ہم کو اس بلا سے محفوظ رکھے جس میں یہ لوگ مبتلا ہوئے اور جب تک ہم زندہ رہیں ہمیں حق اور گروہ حق کا ہمنوا رکھے۔

معاویہ کے بعض ہوا خواہوں کا یہ زعم ہے کہ صلح حسنؑ کے بعد اُمّت کا معاویہ پر اجتماع، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اُمّت کا اجماع ہو گیا اور اجماع حُجّت ہے۔ لیکن یہ مغالطہ اور نری دھاندلی ہے۔ یاد رکھو، اجماع اور ہے اور اجتماع اور ہے۔ اجماع کے تو معنی جیسا کہ اصولیین نے بیان کیے ہیں یہ ہیں کہ اُمّت کے کل مجتہدین کا کسی امر پر اتفاق کرنا جس پر کتاب یا سُنّت سے کوئی دلیل بھی ہو جو اجماع کرنے والوں کا مستند ہو۔ اب غور کرو کہ یہاں

پر معاویہ کی ولایت کی حقیت پر کون سی دلیل ہے اور کس مجتہد نے اس کی تصریح کی ہے۔ البتہ (جب مہمل ہی کہنا ہے تو) کسی کا دل گوارہ کرے تو یہ کہدے عمرو، مغیرہ، سمرہ، زیاد اور از یں قبیل کے لوگ جن کو دین سے نہ کوئی واسطہ تھا، نہ بہرہ۔ (یہ تھے مجتہدین، تو اس کے دین کا کیا کہنا، سبحان اللہ) لیکن اہلِ علم وفضل و دین تو ان میں سے اکثر نے تصریح کردی ہے۔ جیسا کہ بیان کر چکا کہ معاویہ بزور شمشیر غالب آیا تھا اور ناحق اس پر حملہ آور ہوا تھا اور اپنی بیعت پر کثیر تعداد لوگوں پر جبر کیا تھا اور کتنوں پر کیسے کیسے سخت ستم کیے اور کتنوں کو قتل کر ڈالا۔ جن لوگوں نے بیعت سے انکار کیا، ہاں اگر یہ کہو کہ اس پر ناحق اجتماع ہوا تو یہ مانتا ہوں۔ واقعہ ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پیشین گوئیوں کے ضمن میں دے گئے تھے، جو فتنے آپ کی اُمّت کو سہنے ہوں گے۔ ملاحظہ ہو نعیم بن حماد نے فتن میں سفیان سے روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ میں امام حسنؑ کے پاس آپ کے مدینے واپس ہونے کے بعد حاضر ہوا، اور میں نے کہا کہ اے مذل المومنین! اس کے خلاف جو دلیلیں امام حسنؑ نے میرے سامنے پیش کیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی، فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے، کچھ دن نہ گزرنے پائیں گے کہ اس اُمّت کی حکومت ایک ایسے شخص کے لیے جمع ہو جائے گی جو چوڑے حلق والا ہوگا، کھاتا جائے گا مگر سیر نہ ہوگا، وہ معاویہ ہے۔ اس وقت میں نے کہا کہ بے شک امر خدا ہو کے رہتا ہے۔ اور ابو نعیم نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، انھوں نے فرمایا کہ جب

تم دیکھنا کہ شام کی حکومت ابن ابوسفیان کے لیے پوری ہوگئی تو مکہ بھاگ آنا۔ لوگوں کا اُس پر اجتماع ہوگا۔ درآنحالیکہ ان میں سے اکثر مجبور ہوں گے، اس کو معذور نہیں بنا سکتا اور اس کے عذاب میں کوئی کمی نہیں کر سکتا۔ اگر ہم معاویہ کے ہوا خواہوں کا یہ زعم کہ کل لوگ اس کے مطیع تھے مجادلہ کے طور پر فرض بھی کرلیں اور یہ کہ وہ قرشی تھا اور اس کی امامت ظاہراً جائز ہو سکتی ہے، تو بھی یہ تو معلوم ہو کہ وہ رحمت، وہ عدل، وہ وفا جس کی شرط الائمۃ من قریش والی حدیث میں کی گئی۔ وہ بھی اس حد تک کہ اگر ان سے کسی ایک شرط کو کوئی پورا نہ کرے تو اس پر خدا، فرشتے اور تمام انسانوں کی لعنت واجب ہوتی ہے۔ وہ کہاں ہے۔ رحمت سے کیا واسطہ وہ تو لوگوں کو زہر دے کر قتل کرتا تھا، بے گناہ قتل کرتا تھا، لوگوں کے گھر گروا دیتا تھا، لوگوں کو جلاوطن کرا دیتا، لوگوں پر ظالموں کو مسلّط کرتا تھا۔ جو اُن پر بُرے بُرے عذاب کیا کرتا تھا اُسے عدل سے کیا واسطہ؟ جو بجائے فراش کے زانی کو اس کا لڑکا دلواتا تھا، چاندی سونا اپنے واسطے مخصوص کر لیا تھا۔ مسلمانوں کا مال خوب اسراف کے ساتھ اپنی خواہش نفسانی کے مطابق تباہ کرتا تھا۔ ناحق ہی حاصل کرتا تھا اور ناحق ہی خرچ کرتا تھا، اس کو وفا سے کیا واسطہ؟ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرما دیا تھا کہ وہ اور عمرو عاص عذر پر اتفاق کریں گے، اور علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے وہ (معاویہ) عذر کرتا ہے اور فاجر ہے۔ اگر اس کا کوئی اور عذر

نہ بھی ہوتا تو اس کی ایک یہی بدعہدی کافی ہے جو اس نے امام حسن بن علی علیہم السلام کے معاہدہ کے باب میں کی۔ اسے طالب حق! تم حدیث مذکور کے پورے متن پر جمے رہو۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ائمہ قریش سے ہوں گے، ان کا حق تم پر ہوگا، تمہارا حق اُن پر ہوگا۔ اگر اُن سے درخواستِ رحم کی جائے گی وہ رحم کریں گے، اگر ان کے پاس مقدمہ جائے گا تو وہ عدل کا فیصلہ کریں گے۔ اگر وہ کوئی عہد کریں گے تو وہ اس کی پابندی کریں گے۔ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو اس پر خدا کی لعنت، ملائکہ کی لعنت، اور کل انسانوں کی لعنت۔ ایسے شخص کا فریضہ اور نافلہ خدا کچھ نہ قبول کرے گا۔ اس حدیث کے بہت سے طرق ہیں، جن کو حافظ ابن حجر نے ایک کتاب میں جمع کیا ہے، جس کا نام "لذۃ العیش فی طرق حدیث الائمۃ من قریش" رکھا ہے۔

مسعودی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بیان کیا منصور بن وحشی نے، ان سے ابوالفیاض عبداللہ بن محمد الہاشمی نے، ان سے ولید بن بختری عبسی نے، اُن سے حرث بن مسمار البہرانی نے کہ معاویہ نے صعصعہ بن صوحان العبدی کو اور عبداللہ بن الکواء البشکری کو، اور کچھ لوگ جو اصحاب علیؑ سے تھے ان کو کچھ قریش کے لوگوں کو قید کر دیا۔ اس کے بعد معاویہ ان کے پاس گیا اور کہا کہ میں تم لوگوں کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، تم لوگ حق اور صدق کہو کہ تم لوگوں نے مجھے کیسا خلیفہ پایا۔ اس پر ابن الکواء نے کہا کہ اگر تم نے قسم نہ دے دی ہوتی تو میں ہرگز

نہ بولتا کیونکہ تم جبار عنید ہو، نیکو کاروں کو قتل کرتے ہو، اور اللہ سے ذرا نہیں ڈرتے لیکن اب تو ہم کو کہنا ہے۔ جہاں تک ہم کو علم ہے تیری دنیا تو بڑی وسیع ہے لیکن تیری آخرت بڑی تنگ ہے۔

اندھیرے کو روشنی اور روشنی کو اندھیرا بنا دیتا ہے

اس کے بعد صعصعہ نے گفتگو شروع کی اور فرمایا کہ اے ابن سفیان! جو کہنا تھا کہہ ڈالا، اور جو تیرا ارادہ تھا پورا ہو گیا۔ لیکن جیسا تو نے کہا ویسا واقعہ نہیں ہے۔ وہ کیوں کر خلیفہ ہو سکتا ہے جو لوگوں پر قہراً بادشاہ بن بیٹھا ہو اور ان کو تکبر سے روند ڈالا ہو، اور جو لوگوں کا حاکم جھوٹ اور اسباب باطل اور مکر سے بن گیا ہو۔ کان کھول کر سن لے کہ نہ تو بدر میں تو نے کوئی خدمت کی، بلکہ اُلٹے تو اور تیرا باپ اسلام کے مخالف لشکر اور بھڑکانے والے لوگوں میں تھے۔ جن لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لشکر جمع کیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تو طلیق ابن طلیق ہے تم دونوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کیا تھا۔ تو بھلا آزاد کردہ خلافت کی صلاحیت کیوں کر رکھ سکتا ہے۔ اس پر معاویہ بول اٹھا کہ اگر میں ابوطالبؑ کے قول کی طرف متوجہ نہ ہوتا کہ:

قابلت جھلھم حلما و مغفرۃ

والعفو عن قدرۃ ضرب من الکرم

'میں نے ان لوگوں کے جہل کا مقابلہ حلم اور مغفرت سے کیا،

اور قدرت کے باوجود معاف کر دینا کرم کی ایک قسم ہے"۔ (تو میں تم سب کو قتل کر ڈالتا)۔

میں کہتا ہوں کہ اس سرکش گمراہ نے جو ان لوگوں کو اس وقت قتل نہ کیا تو نہ اس لیے کہ اُسے منتقم جبار کا خوف یا ورود فی النار سے ڈر تھا۔ بلکہ محض اس لیے قتل نہ کیا جیسا کہ اس نے خود ہی ظاہر بھی کر دیا کہ اس طرح لوگ اس کو حلیم و کریم کہیں۔ چنانچہ اس کے ہوا خواہوں نے اس کی یہ خواہش پوری بھی کر دی۔ بلکہ اس پر بھی انھوں نے ایسا اضافہ کر دیا جس سے باطل کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اس طرح ان لوگوں نے حق کا چہرہ بگاڑ دیا اور ظلم و زور کے پشتے لگا دیے"۔

صاحبِ نصائحُ کافیہ کی اس عبارت کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی ـــــ تنقیح طلب امور خود بخود حل ہو گئے۔ صلح کرنا صحیح تھا واضح ہو گیا۔ اس صلح سے ہرگز معاویہ کی خلافت کی صحت نہ نکل سکی۔ وہ خلافت الٰہیّہ کا مالک نہ بن سکا۔ (یعنی بخیال اہلسُنّت ویسی خلافت کا مالک نہ ہوا، جیسی وہ خلفاء ثلاثہ کے لیے مانتے ہیں۔ شیعوں کی سی خلافت الٰہیّہ کا تو ذکر ہی نہیں)۔ امام حسنؑ نے ہرگز اس کے افعال کو واجب الاطاعۃ نہ مانا، بلکہ بالکل واضح ہوا کہ جو کچھ امام حسن کی طرف سے ہوا حق، اور جو معاویہ کی طرف سے ہوا باطل۔ اب اس صلح سے سُنّیت کے اعتبار سے بھی معاویہ کو کوئی فائدہ یا امام حسنؑ کو کوئی ضرر نہیں پہونچتا۔

جہاد اور صلح کی شرعی حیثیت سُنّی مذہب کے اعتبار سے:

کتاب عین الہدایہ جلد دوم ص ۵۴۳ نولکشور پریس ۱۳۱۲ھ، کتاب السیر

باب الموازنہ کی عبارت ذیل اس موقع پر قابل ملاحظہ ہے:

"اگر امام کی رائے ہو کہ اہل حرب اور ان میں سے کسی فریق سے صلح کرے اور اس میں مسلمانوں کے لیے مصلحت ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اہل مکہ سے حدیبیہ والے سال صلح کی تاکہ اپنے اور کفار کے درمیان لڑائی کو روک دیں دس سال کے لیے اور اس لیے بھی کہ صلح معنی کے اعتبار سے جہاد ہی ہے جب کہ اس میں مسلمانوں کے لیے بھلائی ہو لان المقصود ھو دفع الشر حاصل بہ کیونکہ اصل مقصود دفع شر ہے اور وہ اس صورت میں حاصل ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"اگر امام اہل حرب سے مال لے کر صلح کرنے کی رائے رکھتا ہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ جب بغیر مال کے صلح جائز ہے تو مال لے کے بھی جائز ہو گی۔"

بڑے تعجب و افسوس کی بات ہے کہ کفار سے صلح تو جائز ہو اور صلح کے بعد مسلمان اپنی جگہ پر مسلمان اور برحق باقی رہیں اور کفار اپنی جگہ پر ناحق باقی رہیں اور صلح کے کرنے نہ کرنے کا فیصلہ امام کی رائے پر ہو۔ لیکن مولفۃ القلوب کے مقابلہ میں یا صلح ناجائز ہو جائے یا جائز ہو تو پھر امام ثابت تو ناحق پر ہو جائے اور جانب مخالف امام حق بن جائے۔

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ اظہر حسین
۴] علامہ سید علی نقیؒ
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید نظام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ہما زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم